---

## معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے — فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY**
**AZAMGARH**

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

---




جلد ۱۶۶ ماہ جمادی الاخری ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۰ء عدد ۳


## فہرست مضامین

# شذرات

جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور موجودہ چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے فروغ علم کے لیے مسلمانان ہند سے ایک اپیل کی ہے جس کی تائید و توثیق ملک کی پانچ دانش گاہوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی اور حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مسلمان وائس چانسلروں نے بھی کی ہے، یہ ایک دردبھری فریاد ہے جس سے اپیل کرنے والوں کی طبیعت کی دردمندی اور مسلمانوں کے تئیں فکرمندی اور ان کی پسپائی، پامالی اور ذلت و خواری کو عزت و سربلندی اور عظمت و وقار میں تبدیل کردینے کے لئے بے چینی، بے قراری اور تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی دردبھری صدا کو لطف و تفریح کی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنا زیادتی ہوگی ؎

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے  دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

---

گفتگو کا آغاز مسلمانوں کے ادبار و تنزل کے بھیانک منظر سے ہوا ہے جس کا ایک بہت بڑا سبب تعلیمی پسماندگی کو بتایا ہے، ہندوستان کی آزادی کے بعد شرح خواندگی کی کمی سرکاری دستاویزات اور سروے رپورٹ سے دکھاتے ہوئے یو۔پی، بہار، راجستھان اور ہریانہ کے بعض اضلاع میں دس فیصد سے بھی کم بتایا ہے گویا اس معاملے میں مسلمان آدی واسیوں سے بھی سبقت لے گئے ہیں، جابجا علم و تعلیم کی اہمیت اور اس سے بے پروائی کی مضرت بیان کی گئی ہے، خواندگی کو قرآن کی اولین ہدایت بتایا ہے، اس کے باوجود اگر مسلمان کروٹ نہیں بدلتے اور جہالت، بے حسی اور بے خبری پر قانع رہتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس زوال سے نہیں بچاسکے گی جو فنا کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ان کی غیرت کو تازیانہ لگانے کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ؎

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ  رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

---

اپیل یہ ہے کہ مسلمان بے حسی چھوڑ کر اور جمود توڑ کر تعلیمی حالت میں انقلاب برپا کرنے کے لئے سوجتن اور ہزار قربانیاں دیں، اپنے اور پڑوسیوں کے بچوں کے نام اسکول میں لکھائیں، مادری زبان اردو لکھانے پر اصرار کریں، اردو کے اساتذہ نہ ہوں تو مقامی حکام سے درخواست کریں، محلے کی مسجدوں اور گھروں پر بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کریں، اپنے بھائیوں کو جہالت اور افلاس سے نکال کر انہیں آگے بڑھانے کے لئے اجتماعی کوشش اور ممکن تعلیمی وسائل اختیار کریں، معیار میں بے حد پیچھے ہوجانا اور گھروں میں حصول تعلیم کے لئے سازگار ماحول نہ ہونا شرح خواندگی سے بھی زیادہ تشویش ناک ہے، ہر گاؤں اور ہر محلے میں تعلیمی کمیٹی اور انجمنیں بنا کر بچوں کی کوچنگ کا انتظام کریں، ملک کے کئی صوبوں میں "اسکول چلو" تحریک چلائی جارہی ہے۔ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، مسلم اسکولوں کی خانہ جنگی، انتظامیہ کی بے جا مداخلت، اساتذہ کی فرائض منصبی سے غفلت، معیار کی پستی اور اکثر اسکولوں کے تشویش انگیز نتائج کے خلاف والدین رائے عامہ بنائیں، ذہین طلبہ اور فرض شناس معلموں کی ہمت افزائی کے لئے فنڈ قائم کریں، حکومت سے مطالبات کرتے رہیں مگر اس پر انحصار نہ کریں بلکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی کوششوں پر اعتماد کریں۔

---

مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں میں اور گھروں پر بھی دینی تعلیم کا اطمینان بخش اہتمام کریں اور دینی مدارس کے طلبہ کو عصری امور و تغیرات سے بہرہ ور رکھیں، مسلمانوں کے اسکولوں میں ریاضی، سائنس اور انگریزی کے نتائج اکثر خراب رہتے ہیں، اس کے لئے منصوبہ بندی کریں، سائنس ٹکنالوجی خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی کی تعلیم میں مہارت کے لئے منظم اور ہمہ جہت کوشش کریں، بچوں کے ذہنی افق کو وسیع کرنا اور ان میں جستجو پیدا کرنا ماؤں کا کام ہے اس لئے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف زیادہ دھیان دیں، بچوں کو گھریلو دھندوں اور چھوٹی دوکانداریوں میں لگانا اور ان کی نشو و نما پر توجہ نہ دینا مجرمانہ غفلت ہے، ان کو مزدوروں میں نہ بدلیں، آپ سے تعلیم کا بندوبست نہ ہوسکے تو حکومت کو متوجہ کریں، یو۔پی میں غریب مسلمانوں کو دسویں جماعت تک وظیفہ دیا جاتا ہے، اس برق رفتار دنیا میں کسی فضیلت کے علاوہ بقا کی کوئی شکل نہیں۔ اٹھئے اپنی باعزت اور باوقار بقا کا اہتمام کیجیے، اپیل کا لب لباب ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بیان کردیا گیا مگر اس کے اخلاص، سوز و درد اور تڑپ کی تصویر کشی کہاں ہوسکتی ہے؟

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا  تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

---

یہ خوگر حمد بڑے ادب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ جو مسلمان اپنے طور پر مکتب یا مدرسہ قائم کرکے اس میں اپنے بچوں کو داخل کرتے ہیں ان کا مسئلہ الگ ہے اور جو تعلیمی، معاشی اور سماجی حیثیت سے اتنے فروتر ہیں کہ مکاتب قائم کرنا تو در کنار اپنی ناداری کی وجہ سے سرکاری اسکولوں میں بھی اپنے بچے داخل کرنے کی وسعت نہیں رکھتے اور ان کو مزدوروں میں بدلنے کے لئے مجبور رہتے ہیں ان کا مسئلہ الگ ہے مگر ہمارے قابل احترام فاضلین نے ان دونوں کے لئے ایک ہی نسخہ تجویز کیا ہے کہ سرکاری پرائمری اسکولوں میں ضرور داخلہ لیں۔ یہ نسخہ اول الذکر لوگوں کے لئے بے معنی اور موخر الذکر قسم کے لوگ اپنے مسلم نام کو جب ہندو نام لکھ دئے جانے پر کچھ نہیں کر پاتے تو وہ بھلا اردو کو اپنی مادری زبان لکھانے کے لئے اصرار اور اردو استاد مہیا کئے جانے کی درخواست کیا کر سکیں گے۔

یہ نسخہ اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب علمی، تعلیمی اور ملی و سیاسی رہنما پس ماندہ علاقوں میں داخلے کے وقت ڈیرے ڈال دیں اور درمیان میں بھی کئی بار ان کے مسائل کا جائزہ لیتے اور دیکھ بھال کرتے رہیں، پھر ابتدائی سرکاری اسکولوں کا ابتر حال کس سے مخفی ہے ایسے میں "اسکول چلو" مہم کو کیا کہا جائے؟ ہمیں بتایا جائے کہ کیا واقعی دسویں جماعت تک وظیفہ مستحقین کو ملتا ہے، یہ بھی ارشاد ہو کہ جن اسکولوں میں داخلے کے لئے اس قدر زور دیا جا رہا ہے کم از کم شمالی ہندوستان کی حد تک ان میں مسلمان بچوں کے عقیدہ و مذہب کے تحفظ کی کوئی ضمانت ہے، جہاں مسلمانوں کے زیر انتظام اسکولوں اور کالجوں میں وندے ماترم نہ پڑھنے پر فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے وہاں پرائمری درجات کے سرکاری اسکولوں کے بچوں سے کیا کچھ نہ کہلایا اور پڑھایا جاتا ہوگا۔ بیسک تعلیم کے ایک ماہر اور آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اپنے ہفت روزہ اخبار ندائے ملت میں سرکاری اسکولوں کا حال زار وقتاً فوقتاً بیان کرتے رہتے ہیں، ان کو ملاحظہ فرمایا جائے اور شاہیں بچوں کو خاک بازی کا سبق نہ دیا جائے حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ظلمات بعضہا فوق بعض میں گھر گئے ہیں اور راستہ نہیں پا رہے ہیں، ان کے لئے نظری کے بجائے قابل عمل راہیں تجویز کی جائیں۔

---



## مقالات

# ماہیت باری تعالیٰ پر ایک نظر

## قدیم و جدید کی روشنی میں

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی ٭

(۲)

**کواسر جہنم کا ایک نمونہ**

نیز ان کے علاوہ ہماری کائنات میں سیاہ سحابیہ (Dark nebulae) بلیک ہول (Black Hole) کواسر (Ouasars) پلسار (Pulsar) دوہرے ستارے (Dubble Stars) سرخ دیو (Red Giant) اور سفید بونا (White Dwarf) وغیرہ متعدد قسم کے حیرت انگیز مظاہر قدرت بھی پائے جاتے ہیں جو انسان کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں اور ہماری کائنات کی وسعت سے سر چکرانے لگتا ہے۔ ان سب کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کواسر کی ماہیت پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جاتی ہے جو حقیقتاً دہکتی ہوئی جہنم کا ایک نمونہ ہونے کے علاوہ انتہائی بعید ترین فاصلے پر واقع ہے۔

بہت سے کواسر کی جسامت ہمارے نظام شمسی کی جسامت (اپنے مدار سمیت) کے برابر ہے مگر ان کی تپش ہمارے سورج سے دس کھرب گنا زیادہ ہے۔ اکثر ماہرین فلکیات کا یقین ہے کہ ہماری کائنات میں دریافت شدہ مظاہر میں کواسر سب سے زیادہ دوری پر ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض ہماری زمین سے سولہ ارب نوری سال کی دوری پر واقع ہو سکتے ہیں۔

Most ouasars may be about the size of the solar system.

---

٭ جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور - ۲۹۔

But they can be trillion times brighter than the sun. Many astronomers believe quasars are the most distatn objects yet detected in the universe. Some may be as far as 16 billion light-years from the earth.[1]

واضح رہے ہمارے سورج کی اندرونی تپش ڈیڑھ سے دو کروڑ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اب اسے دس کھرب سے ضرب دیجئے تو ایک محیرالعقول عدد ہمارے سامنے آئے گا اور اس قدر زبردست تپش و حرارت کا راز کیا ہے؟ اس کی حقیقت ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ غرض اب تک پانچ ہزار کواسر دریافت کئے جاچکے ہیں اور ان کی دریافت سب سے پہلے ۱۹۵۰ء کے دہے میں ہوئی۔[2] کواسر کی دو تصویریں آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا میں دیکھی جاسکتی ہیں جو دوربینوں کی مدد سے اتاری گئی ہیں۔[3] روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس حساب سے وہ ایک سال میں جتنا فاصلہ طے کرتی ہے اسے نوری سال (لائٹ ایئر) کہا جاتا ہے۔ اس سے آپ کواسر کے بعید ترین فاصلے کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

**سائنس دانوں کی حیرانی** یہ وہ حقایق ہیں جو جدید سائنس دریافت کررہی ہے اور نہیں معلوم کہ ہماری اس کائنات میں کتنے ایسے رازہائے سربستہ موجود ہیں اور ہماری کائنات کے ماورا ایسی کتنی مزید کائنات واقع ہیں جو ہماری معلوم کائنات سے یکسر مختلف ہوسکتی ہیں، مگر قدیم فلاسفہ اور ان کی اتباع کرنے والے متکلمین نے بغیر علم صحیح یا تجربے و مشاہدے کے محض فتوے بازانہ انداز میں اس طرح دعوے کردئے گویا کہ انہوں نے ساری کائنات چھان ماری ہو۔

بہرحال مادہ کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ نیز یہ کہ ہماری اس معلوم کائنات میں مادہ کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ انسان انہیں بالکل نہیں جانتا۔ بلکہ وہ جو کچھ بھی جانتا ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود مادے کے چند ظاہری خواص ہیں۔ ورنہ اس کی اندرونی



کیفیت یا باطنی خواص سے (جو عالم غیب سے متعلق ہیں) پوری دنیائے سائنس ناواقف ہے۔ چنانچہ یہ ایک مانی ہوئی اور مسلم حقیقت ہے کہ سائنس کسی بھی چیز کی مکمل صداقت بیان نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ عصر حاضر کے ایک نامور فلسفی (سی۔ ای۔ ایم جوڈ) نے صاف صاف اعتراف کیا ہے:

Science is compitent to tell us something about every thing but it can not tell us whole truth about any thing.[4]

**قدیم فلاسفہ کی لن ترانیاں** ظاہر ہے کہ جب جدید سائنس باوجود اپنی ہمہ گیر ترقی اور تحقیق و تجربے کے کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ اور کوئی یقینی آخری بات کہنے کے موقف میں نہیں ہے تو پھر ہزاروں سال پہلے کے فلاسفہ کس حساب میں آتے ہیں جو مادے سے متعلق کسی حقیقت و صداقت کا حتمی طور پر فیصلہ کردیں یا کوئی "فتویٰ" صادر کردیں، رویت و مشاہدہ اور تحقیق و تجربہ تو ان کے یہاں "مکروہ تحریمی" کی حد تک ممنوع تھا۔ وہ صرف ظن و قیاس سے کام لیتے ہوئے محض خیالی نظریات قائم کرتے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے انتہائی جسارت کے ساتھ موجودات عالم کو "واجب" اور "ممکن" دو اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے خدائے عظیم کو "بسیط" یعنی غیر مرکب یا ایک حقیر ترین شے قرار دینے کا ارتکاب کیا اور اس سلسلے میں ایسے عقیدے ایجاد کئے گویا کہ انہوں نے پوری کائنات کا سروے کرکے خداوند قدوس تک کا بھی مشاہدہ و معائنہ کرلیا ہو۔ معاذاللہ اور پھر فلسفہ زدہ لوگوں نے خدائے جل جلالہ کی حقیقت ہی مشتبہ کردی، گویا کہ اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہے۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ من ھذہ الخرافات۔

واقعہ یہ ہے کہ یونانی "افلاک" کی دنیا انتہائی محدود تھی جو چند ستاروں اور سیاروں پر مشتمل تھی اور ان کی نظر میں یہ سب ستارے و سیارے افلاک میں جڑے ہوئے تھے، جو شیشے کی طرح شفاف تھے۔ یہ افلاک تعداد میں نو تھے، جن کے اس پار کوئی چیز موجود نہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا اور یہ افلاک

ان کی نظر میں ٹوٹ پھوٹ نہیں سکتے تھے اور وہ عقل و شعور سے متصف اور متحرک بالارادہ قرار دئے گئے۔ نیز یہ کہ کرۂ قمر سے نیچے جتنے بھی اجسام (موالید ثلاثہ) موجود ہیں وہ عناصر اربعہ سے مرکب مانے گئے۔ یہ تھی یونانیوں کی تصوراتی کائنات جو اب ایک داستان پارینہ بن چکی ہے۔

**متکلمین کے موقف پر ایک نظر** | یہ تھا مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد و نظریات کا خلاصہ اور تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں ان کا جائزہ۔ اس بحث سے یہ حقیقت بخوبی واقف ہوگئی کہ سلف صالحین کا مسلک ہی قرآن و حدیث سے قریب ہے۔ چنانچہ ان دونوں کی تعلیمات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا شخصی وجود ضرور ہے اور اس کی عظیم ترین ہستی اپنے پیکر میں جلوہ افروز ہے۔ وہ حی و قیوم ہے اور اسی کے سہارے پوری کائنات قائم ہے جو اسے تھامے ہوئے ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا) وہ تمام مخلوقات سے نرالا اور بے مثال ہے۔ ایسی عظیم ترین ہستی ایک جوہر سے بھی کم تر یا لاشئے نہیں ہوسکتی۔ مگر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم بندوں کو نہیں دیا گیا۔

توحید باری کا عقیدہ دین کی بنیاد ہے اور اس کی صحت ہی کی بنیاد پر بقیہ تمام عقائد کی صحت موقوف ہے۔ لہٰذا اگر یہ غلط ہوجائے تو پھر سارے عقائد غلط ہوجائیں گے۔ مگر معتزلہ نے اپنے "نظریۂ توحید" یعنی نفی ذات" کا صور اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ ان کے بعد والے تقریباً تمام متکلمین اسلام جن کا تعلق اہل سنت والجماعت سے تھا۔ انہوں نے بھی معتزلہ کے "دلائل" کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے اور انہیں کی بولی بولنے لگے۔ چنانچہ آج دنیائے اسلام میں عقائد و کلام کی جتنی بھی کتابیں موجود ہیں تقریباً سب کی سب معتزلہ کے عقیدے ہی کی ترجمان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) جوہر نہیں ہے، وہ جسم نہیں ہے، وہ عرض نہیں ہے اور وہ کسی جہت میں نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔



بلکہ متاخرین اشاعرہ نے تو حد کر دی کہ وہ معتزلہ کے اس مردود عقیدے پر متفق ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر نہیں آ سکتا۔[۶]

غرض اس موقع پر بات کو طول دینے کے بجائے بعض ائمہ اسلام کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ انہوں نے عقیدۂ سلف کی ترجمانی کرنے کے بجائے معتزلہ ہی کی پیروی کی ہے۔

**امام غزالی کے دعوے** | چنانچہ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے جلیل القدر عالم (جو حجۃ الاسلام کہلاتے ہیں) بھی اسی رو میں بہہ گئے ہیں۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں: ہم جانتے ہیں کہ ہر موجود چیز یا تو متحیز (کسی جگہ میں قائم) ہوگی یا غیر متحیز ہوگی اور یہ کہ ہر متحیز جس میں ائتلاف (جوہری ترکیب) نہ ہو تو ہم اسے جوہر فرد کہیں گے۔ اگر وہ دوسرے (جوہر فرد) کے ساتھ مرکب ہو تو ہم اسے جسم قرار دیں گے اب رہا غیر متحیز (جو کسی مکان یا جہت میں نہ ہو) تو وہ یا تو اپنے وجود کے لئے کسی جسم کا طالب ہوگا، جس کے ساتھ وہ قائم رہ سکے، تو اسے ہم "اعراض" کہیں گے۔ ورنہ اگر وہ کسی دوسرے جسم کا طالب نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ موصوف کی اصل عبارت یہ ہے:

ثم نعلم ان کل موجود اما متحیز او غیر متحیز وان کل متحیز ان لم یکن فیہ ائتلاف فنسمیہ جوھرا فردا وان ائتلف الی غیرہ سمیناہ جسما وان غیر المتحیز اما ان یستدعی وجودہ جسما یقوم بہ ونسمیہ الاعراض او لا یستدعیہ وھو اللہ سبحانہ وتعالیٰ[۷]

اس اعتبار سے گویا کہ اللہ تعالیٰ "جگہ گھیرنے والی" یا کسی مکان میں "قائم" ہستی نہیں ہے۔ گویا کہ وہ کوئی "شئے" یا جسم بالکل نہیں ہے۔

اور دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں کہ: ذات باری تعالیٰ پر نظر ڈالنا: تو ہم اس بارے میں

اس کے وجود کی وضاحت اس طرح کریں گے کہ وہ قدیم ہے' وہ باقی ہے' وہ جوہر نہیں ہے، وہ جسم نہیں ہے' وہ عرض نہیں ہے' وہ کسی حد میں محدود نہیں ہے اور کسی جہت میں مخصوص نہیں ہے نیز یہ کہ وہ دکھائی دے گا جیسا کہ معلوم ہے اور یہ کہ وہ احد ہے۔

النظر فی ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ فنبین فیہ وجودہ وانہ قدیم وانہ باق وانہ لیس بجوھر ولا جسم ولا عرض ولا ھو محدود بحد ولا ھو مخصوص بجہۃ وانہ مرئی کما انہ معلوم وانہ واحد۔[1]

ظاہر ہے کہ یہ سب ادعائی باتیں اور بے بنیاد دعوے ہیں' جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب باری تعالیٰ جسم نہیں ہے، عرض نہیں ہے اور کسی جہت میں بھی نہیں ہے تو پھر وہ آخر ہے کیا چیز جو نظر آنے کے قابل ہو؟ اور اس کو "ایک معلوم حقیقت" کس طرح کہا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے (کما انہ معلوم) ظاہر ہے کہ یہ دونوں متضاد دعوے ہیں جو عقل کی سمائی میں نہیں آ سکتے۔ سائنٹفک نقطۂ نظر سے یہ ایک مہمل عقیدہ ہے اور اس سے سوائے تشکیک کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجرد دعوے ہیں جو "تماثل اجسام" اور "حدوث اجسام" کے مہمل نظریات پر مبنی ہیں۔ کیونکہ حدوث اجسام کی بحث سے خدائے تعالیٰ کا وجود بالکل مشتبہ ہو جاتا ہے۔ لہذا اس استدلال میں فائدے سے زیادہ نقصان ہے۔ مگر اس استدلال کے قائلین نے تصویر کے اس دوسرے رخ کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں "مادہ" اور کائنات کا تصور بہت محدود تھا۔

مگر اس کے باوجود امام صاحب نے اپنی ایک دوسری کتاب "المستصفیٰ" میں مسئلہ "استقراء" کی بحث میں اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کے قائلین اور ان کی دلیل کا رد کرتے ہوئے ان کا مذاق اڑایا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اس مباحثے کو سوال وجواب کے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے: "جس نے یہ بات کہی وہ غلط ہے کہ صانع عالم (خالق کائنات) جسم ہے۔ کیونکہ ہر فاعل



جسم ہوتا ہے۔ چونکہ صانع عالم فاعل ہے اس لئے وہ جسم ہوگا۔ اس پر امام صاحب اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: تم نے کیوں کہا کہ ہر فاعل جسم ہے؟ تو معترض اس کے جواب میں کہتا ہے کیونکہ میں نے تمام فاعلین جیسے درزی' معمار' موچی' حجام اور آہن گر وغیرہ کو دیکھا ہے کہ وہ (سب کے سب) جسم ہیں۔

اس کے جواب میں امام غزالی فرماتے ہیں کہ کیا تم نے صانع عالم کا بھی جائزہ لیا ہے یا نہیں؟ اگر تم نے اس کا جائزہ نہیں لیا ہے تو تم نے صرف بعض ہی کا جائزہ لیا ہے اور بعض فاعلین ہی کو جسم پایا ہے۔ لہذا (اس منطقی استدلال میں) دوسرا مقدمہ خاص ہو گیا جو بے نتیجہ ہے۔[1]

حیرت ہوتی ہے کہ امام غزالی جیسے قابل اور مانے ہوئے عالم نے اس قدر پھسپھسا دعویٰ کس طرح کر دیا؟ سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کئے بغیر اس کے جسم ہونے کا دعویٰ کرنا غلط ہے تو پھر اسے دیکھے بغیر اس کے غیر جسم ہونے کا دعویٰ کرنا صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ عدم جسمانیت کے قائلین نے صرف ہمارے اجسام پر قیاس کرتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ کر دیا ہے۔ خالق کائنات کا مشاہدہ کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ انہوں نے ہمارے ہی عالم مادیات کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا ہے کہ اس میں کس کس قسم کے مادے اور کیا کیا عجائب موجود ہیں' جو خلاق عالم نے ہماری عبرت وبصیرت کے لئے رکھ چھوڑے ہیں! چنانچہ اس سلسلے میں بعض حقایق کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید تحقیقات کی روشنی میں تماثل اجسام کا نظریہ فاسد اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے جو "استقرائے تام" کے خلاف ہے۔ تماثل اجسام کا مطلب یہ ہے کہ ہماری کائنات کے تمام مظاہر یکساں یا ہم مثل ہیں۔ چنانچہ یہ نظریہ فلاسفہ نے موالید ثلاثہ (جمادات' نباتات اور حیوانات) کے اجسام کی یکسانیت (عناصر وجواہر کے اعتبار سے) کی بنا پر اختیار کیا تھا، جواب مردود ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں مظاہر کائنات کا

حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لینے اور اشیائے عالم کی تہہ تک پہنچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (یونس: ۱۰۱)
کہدو کہ ذرا غور سے دیکھو کہ زمین اور آسمانوں میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟

اس اعتبار سے یہ حقائق خود امام غزالی کے دعوائے استقرار کے خلاف ہیں۔ خداوند قدوس کا مشاہدہ کرنے سے پہلے خود اپنی کائنات کا مشاہدہ و معائنہ استقرائی طور پر کر لینا چاہئے، ورنہ کوئی بھی دعوی صحیح نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہماری اپنی کائنات میں اتنی مختلف و متضاد چیزیں موجود ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ عالم ملکوت کے احوال و کوائف کیا ہیں؟ لہذا ہم اپنی کائنات پر قیاس کرتے ہوئے عالم ملکوت پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے اور خدائے جل جلالہ کی ماہیت کے بارے میں "فتوے" صادر نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے کسی بھی دعوے پر جو "بلا علم" ہو حسب ذیل قرآنی آیت صادق آتی ہے:

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (یونس: ۳۹)
بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جس کے علم کا وہ احاطہ نہ کر سکے اور اس کی حقیقت ان پر اب تک کھل نہیں سکی ہے۔

**ابن حزم کے ادعائی بیانات** اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کا انکار کرنے والوں میں سب سے زیادہ سخت موقف ابن حزم ظاہری اندلسی (م ۴۵۶ھ) کا ہے، جنھوں نے اثبات جسم کا دعوی کرنے والوں کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور اس قسم کے دعوے کو کفر اور شرک تک قرار دینے کی جسارت کر دی ہے۔ موصوف کی انتہاپسندی یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات سے اختلاف کرنے والوں کی عموماً سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اور بسا اوقات انہیں جاہل تک قرار دیتے ہوئے دعوی کرتے



ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی حق ہے۔ غرض "ماہیت" باری تعالیٰ کے بارے میں انہوں نے "دلائل" کے نام پر جو کچھ کہا ہے وہ خود ساختہ دعوے ہیں جن کی بنیاد یہ ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو جسم مان لیں تو وہ "حادث" بن جائے گا، جسے وقوع میں لانے کے لئے ایک اور فاعل یا محدث کی ضرورت پڑ جائے گی اور اس سے دو خداؤں کا وجود لازم آ جائے گا۔ لہذا خدائے خلاق کے لئے غیر جسم ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ کیونکہ جو جسم ہوگا وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ عجیب و غریب قسم کا استدلال ہے۔ مزید ستم یہ کہ موصوف نے نام نہاد عقلی دلائل کو اصل مانتے ہوئے ان تمام قرآنی نصوص کو جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ، آنکھ، چہرہ اور دیگر اعضاء پر دلالت کرتے ہیں، یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ محض "وجوہ ظاہری" پر مبنی ہیں۔ گویا کہ وہ قابل حجت نہیں ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کا استدلال فاسد ہے۔ حالانکہ موصوف "ظاہری" کہلاتے ہیں، جو نصوص میں تاویل کرنے کے قائل نہیں تھے۔

بہرحال اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو جسم قرار دیں تو اس کی وجہ سے ایک اور "فاعل" ماننے کی ضرورت پڑ جائے گی جو "جسم" نہ ہو۔ لہذا صانع عالم (خالق کائنات) جسم نہیں ہوسکتا۔ اس اعتبار سے موصوف نے شرعی دلائل کو نظر انداز کر کے فرسودہ قسم کے عقلی دلائل ہی کا سہارا لیتے ہوئے ان کو اصل قرار دیا ہے۔ چنانچہ موصوف نے قائلین جسم کے دو دلائل کا تذکرہ اس طرح کیا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کے جسم ہونے پر پہلی دلیل یہ ہے کہ معقولی اعتبار سے کوئی چیز یا تو جسم ہوگی یا عرض[1]۔ جب اللہ تعالیٰ عرض نہیں ہو سکتا تو وہ جسم ہوگا اور پھر کوئی بھی فعل بغیر جسم کے واقع نہیں ہوسکتا۔ لہذا اس کا جسم ہونا ضروری ہے (۲) اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ کے ہاتھ، چہرے اور آنکھ وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ (لہذا عقل و نقل دونوں اعتبارات سے اللہ تعالیٰ کی جسمانیت ثابت ہوتی ہے۔)

یہ تھا مخالفین کا استدلال۔ اس کے جواب میں ابن حزم تحریر کرتے ہیں کہ یہ تمام قرآنی نصوص

ظاہری وجوہ کے حامل ہیں، جو ان لوگوں کے ظن و تاویل کے خلاف ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ دونوں استدلال فاسد ہیں۔ کیونکہ ان کے قول کے مطابق سوائے جسم اور عرض کے کسی اور چیز کا نہ پایا جانا ایک ناقص تقسیم ہے۔ لہذا صحیح بات یہ ہے کہ اس عالم میں سوائے جسم اور عرض کے کوئی چیز پائی نہیں جاتی اور یہ دونوں چیزیں اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک "محدث"[13] کے وجود کی مقتضی ہیں۔ کیوں کہ بدیہی طور پر ہم جانتے ہیں کہ اگر اس عالم کا محدث جسم یا عرض ہو تو وہ اپنے فعل کے لئے ایک فاعل[14] کا مقتضی ہوگا اور ایسا ہونا ضروری ہے اس لئے بدیہی طور پر یہ بات واجب ہوگی کہ جسم و عرض کا فاعل جسم یا عرض نہیں ہو سکتا اور یہ برہان ہے جسے اختیار کرنے پر ہر ذی حس عقلی ضرورت کے باعث مجبور ہے اور ایسا کرنا ضروری ہے۔ نیز اس وجہ سے بھی یہ بات ضروری ہے کہ ان لوگوں کے الحاد کی بدولت باری تعالیٰ جسم ہوگا تو بدیہی طور پر وہ زمان و مکان کا محتاج ہو جائے گا جو اس کے علاوہ ہوں اور یہ بات توحید کو باطل کرنے اور شرک کو واجب قرار دینے کے برابر ہے۔ کیونکہ اس سے دو چیزوں کو برابر قرار دینے اور اللہ کے ساتھ غیر مخلوق اشیاء کو واجب ماننا پڑے گا اور یہ بات کفر ہے۔

یہ علامہ کے بیان کا ملخص ہے جسے ان کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے[15]۔

ظاہر ہے کہ یہ فرسودہ اور خود ساختہ دلائل ہیں۔ دراصل اس پورے فساد کی جڑ جسم اور عرض کی بحث ہے جو "تماثل اجسام" کے مہمل نظریے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر قدیم فلاسفہ نے پوری کائنات کو جوہر اور عرض کا مجموعہ قرار دے دیا جو ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔ انسان خود اپنی ہی حقیقت سے لاعلم ہے۔ عناصر و جواہر کی یہ دنیا ایک "عجائب گھر" کی طرح ہے، جو اپنی آخری تحلیل میں بجلی کے چند ذرات یا برقی لہروں کا مجموعہ ہے اور ان لہروں کو نہ تو "اجسام" کہا جا سکتا ہے اور نہ "اعراض"۔ کیونکہ اس منزل میں آکر مادے کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے اور وہ جسم و عرض کے بجائے صرف برقی لہروں کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی



"مادیت" کھو دیتا ہے اور اس میں "صورت" اور "ہیولیٰ"[16] کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا اور پھر اس پر غضب یہ کہ یہ لہریں آنکھوں کو نظر تک نہیں آتیں۔ بلکہ خود مادے کے ایک یونٹ (جوہر فرد یا ایٹم) کو بھی خالی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ خالی آنکھ سے نظر آنے والے ایک چھوٹے سے مادی ذرہ میں کم از کم ایک ارب ایٹم ہوتے ہیں۔ اس سے آپ "جوہر فرد" یا "جسم" کے انتہائی ننھے پن کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں۔ لہذا معاذ اللہ باری تعالیٰ کو اس سے بھی کمتر درجے کی چیز قرار دینا کیا کوئی معقول بات ہو سکتی ہے؟ پھر اس کا وجود کہاں اور کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ یہ کوئی نہیں بتاتا بلکہ اس مسئلے میں پورا فلسفہ و کلام خاموش ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

صدیوں فلاسفہ کی چناں و چنیں رہی　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

یہ تو ہمارے معلوم و معروف مادے کی کیفیت ہے، جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم ابھی تک اپنے مادے ہی کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں تو پھر عالم بالا کے بارے میں ہم کیا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہاں کی کیفیت کیا ہے جو ہماری نگاہوں سے پوری طرح اوجھل ہے؟

**ابن حزم کا ایک اور دعویٰ** ابن حزم کو اللہ تعالیٰ کے جسم یا عرض ہونے کا سختی کے ساتھ انکار ہے، جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| فقد قام البرھان انہ تعالیٰ | اس بات پر برہان قائم ہو گئی ہے کہ اللہ |
| لیس جسما و لا عرضا[17] | تعالیٰ نہ تو جسم ہے اور نہ عرض۔ |

حالانکہ خدائے تعالیٰ کے غیر جسمانی ہونے پر برہان قائم ہونے کا دعویٰ کرنا انتہائی لغو قسم کی بات ہے۔ کیونکہ وہ محض ایک قیاسی احتمال ہے جو برہان کی قبیل سے نہیں ہے۔ کیونکہ برہان کی بنیاد یقینیات پر ہوتی ہے نہ کہ وہمیات پر۔ غرض اس مغالطہ آمیز استدلال کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سرے سے کوئی شئے نہیں رہا، گویا کہ اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہے۔ استغفر اللہ۔

واقعہ یہ ہے کہ جو چیزیں ماورائے حس یا مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں ان کے بارے میں محض قیاسی طور پر کوئی رائے قائم کر کے کوئی حتمی فیصلہ کرنا یا اسے برہان قرار دینا ناممکن ہے۔ کیونکہ ان مظاہر کی حقیقت سے انسان جاہل محض ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ ابن خلدون تحریر کرتے ہیں:

واما ما کان منہا من الموجودات التی وراء الحس وھی الروحانیات ویسمونہ العلم الالٰہی وعلم مابعد الطبیعۃ فان ذواتہا مجہولۃ راسا ولا یمکن التوصل الیہا ولا البرہان علیہا[18]

**امام رازی کی تاویلات** امام رازی (م ۶۰۶ھ) امام غزالی ہی کی طرح ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں جو فلسفہ وکلام کے بہت بڑے ماہر اور ایک بہت بڑے مصنف تھے۔ خاص کر موصوف کی تفسیر کبیر اپنے فن میں ایک شاہکار ہے، جس کا راقم سطور بہت بڑا قدردان ہے۔ مگر اللہ معاف کرے انہوں نے بھی وجود باری کے سلسلے میں وہی موقف اختیار کر لیا ہے جو غزالی اور ابن حزم وغیرہ کا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اپنی ایک تصنیف "الاربعین فی اصول الدین" میں "ان اللہ لیس بمتحیز" کی بحث میں اللہ تعالیٰ کے "غیر مکانی" ہونے پر آٹھ "دلائل" قائم کئے ہیں، جو وہی گھسے پٹے قسم کے ہیں اور ان کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ ہر وہ چیز جو کسی جہت میں ہو وہ منقسم ہے اور ہر منقسم شے ممکن الوجود ہے (لہذا باری تعالیٰ ممکن الوجود نہیں ہوسکتا)

۲۔ ہر متحیز (کسی مکان یا جہت میں رہنے والا) حادث ہے۔ لہذا اگر باری تعالیٰ متحیز ہوگا تو وہ حادث بن جائے گا۔

۳۔ ہر متحیز ایک محدود مقدار کا حامل ہوتا ہے اور جو چیز ایک محدود مقدار کی حامل ہوگی وہ حادث بن جائے گی۔ لہذا باری تعالیٰ ایک محدود مقدار کا حامل نہیں ہوسکتا۔



۴۔ تمام متحیز چیزیں یا جگہ گھیرنے والی اشیاء اپنی ماہیت میں برابر برابر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر باری تعالیٰ متحیز ہو تو اس کی ماہیت بھی دیگر اشیاء ہی کی طرح ہوجائے گی۔ اس صورت میں وہ ایک مرجح ومخصص کا محتاج ہوجائے گا جو محال ہے[19]

بقیہ دلائل بھی اسی قسم کے ہیں اور ان سب کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مظاہر کائنات یا موجودات عالم کی طرح جسم نہ ہونا چاہئے اور نہ محدود ہونا چاہئے۔ وہ کسی مکان یا جہت میں نہیں ہوسکتا۔ مگر اس موقع پر یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ ایک ایسی چیز جو جسم یا عرض بالکل نہ ہو اور وہ کسی جہت یا مکان میں بھی نہ ہو وہ اپنی ماہیت میں آخر کیا ہوسکتی ہے اور وہ لامحدود کس طرح کہلا سکتی ہے؟ کیا فلسفیانہ نقطہ نظر سے ہماری اس دنیا میں ایسی کسی چیز کا وجود ہوسکتا ہے جو جسم یا عرض بالکل نہ ہو؟ اس سوال کا جواب فلسفی یا متکلم نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ بلکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی جسمانیت سے انکار کرنے کے لئے دلیل پر دلیل قائم کئے جارہے ہیں اور اس پر مزید طرہ یہ کہ قرآن اور حدیث میں ذات باری تعالیٰ کے بارے میں جو مثبت بیانات وتصریحات موجود ہیں انکو کوئی بھی خاطر میں نہیں لارہا ہے۔ گویا کہ خود خلاق عالم کی تصریحات کی کوئی قدر وقیمت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدائے علیم وخبیر سے بڑھ کر اور کس کی بات صحیح اور معتبر ہوسکتی ہے؟

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔ — اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہوسکتی ہے۔

(نساء: ۸۷)

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (رعد: ۹) — وہ پوشیدہ اور ظاہری (تمام چیزوں کا) جاننے والا، سب سے بڑا اور بلند مرتبے والا ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى — وہ عالم غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ اپنی

غٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن: ۲۶-۲۷)

غیبی باتوں سے کسی کو آگاہ نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسول کے۔

اس اعتبار سے عالم غیب کی باتوں سے سوائے اللہ کے رسول کے اور کوئی واقف نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بے چون وچرا ایمان لانا واجب ہے۔ بلا دلیل و مشاہدہ "ٹامک ٹوئیاں مارنا" رجماً بالغیب کے قبیل سے ہے جو الٰہیاتی مسائل میں جائز نہیں ہے۔

علامہ عضد الدین عبد الرحمان ایجی (م ۷۵۶ھ) ایک بلند پایہ متکلم گزرے ہیں، جن کی کتاب "المواقف فی علم الکلام" اپنے فن میں اونچے پائے کی کتاب شمار کی جاتی ہے۔ مگر وہ بہت مغلق اور پیچیدہ مباحث پر مشتمل ہے۔ موصوف فلاسفہ اور متکلمین کے اقوال و آراء بکثرت نقل کرکے ان پر محاکمہ کرتے ہیں۔ مگر ان مباحث میں اکثر و بیشتر کافی التباس نظر آتا ہے۔ اس بنا پر کوئی واضح بات سامنے نہیں آتی اور بسا اوقات یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا اصل نظریہ کیا ہے؟ بہرحال موصوف نے وجود باری کے سلسلے میں متکلمین کے جو دلائل بیان کئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱- حدوث جواہر کے ذریعہ استدلال: یہ عالم حادث ہے اور ہر حادث کے لئے ایک محدث (وقوع میں لانے والا) ضروری ہے۔ (وہی باری تعالیٰ ہے) الاستدلال بحدوث الجواهر: وهو ان العالم حادث، وكل حادث فله محدث۔

۲- امکان جواہر کے ذریعہ استدلال: یہ عالم ممکن ہے۔ کیونکہ وہ مرکب اور کثیر ہے۔ اس لئے ہر ممکن کے لئے ایک علت موثرہ ضروری ہے۔ (جو باری تعالیٰ ہے) الثانی بامکانها: وهو ان العالم ممکن، لانه مرکب وکثیر، وکل ممکن فله علة موثرة۔

۳- حدوث اعراض کے ذریعہ استدلال: چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ نطفہ علقہ میں تبدیل ہوجاتا ہے، اور اسی طرح علقہ مضغہ میں بدل جاتا ہے پھر وہ گوشت اور خون کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ لہٰذا ان تبدیلیوں کے لئے ایک حکمت والے صانع کی ضرورت ہے (جو باری تعالیٰ ہے) الثالث بحدوث الاعراض: مثل ما نشاهد من انقلاب النطفة علقة، ثم مضغة، ثم لحماً ودماً اذ لا بد من موثر صانع حکیم۔



۴- امکان اعراض کے ذریعہ استدلال: وہ یہ کہ تمام اجسام (موالید ثلاثہ) ہم مثل ہیں، اس لئے ان میں سے ہر ایک اپنی (مخصوص نوعی) صفات کا محتمل ہے۔ (لہٰذا) ان صفات کی تخصیص کے لئے ایک مخصص (تخصص کرنے والے) کی ضرورت ہے (وہی خدا ہے) الرابع بامکان الاعراض: وهو ان الاجسام متماثلة، فاختصاص کل بماله من الصفات جائز فلا بد فی التخصیص من مخصص له۔[21]

پھر اس کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ: اس استدلال کے ذریعہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مدبر عالم اگر "واجب الوجود" ہے تو مطلوب حاصل ہے۔ ورنہ اگر وہ "ممکن" قرار پائے گا تو اس کے لئے ایک "موثر" کی ضرورت پڑ جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "دور" یا "تسلسل" لازم آجائے گا، یا پھر بالآخر ایک موثر ماننا پڑے گا۔ جو اپنی ذات میں واجب الوجود ہو۔ پہلی شکل اپنی دونوں قسموں کے ساتھ باطل ہے، لہٰذا دوسری شکل متعین ہوجاتی ہے جو کہ مطلوب ہے۔ ثم بعد هذا الوجوه نقول: مدبر العالم ان کان واجب الوجود فهو المطلوب والا کان ممکنا فله موثر ویعود الکلام فیه ویلزم اما الدور او التسلسل واما الانتهاء الی موثر واجب الوجود لذاته والاول بقسمیه باطل، فتعین الثانی وهو المطلوب۔[22]

اس قسم کی قدیم فلسفیانہ دلیلیں عصر جدید کے ذہن و مزاج کو اپیل نہیں کرتیں جو محض فرضی و تخیلاتی (غیر تجرباتی) ہیں۔ جدید فلسفے کا مزاج یہ ہے کہ وہ سائنسی تحقیقات یا نظام کائنات کے ثابت شدہ

حقائق کو بنیاد بناکر گفتگو کرتا ہے۔ اس اعتبار سے موجودہ دور کے ذہن و مزاج کے مطابق ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے، جو سائنسی تحقیقات کو بنیاد بناکر گفتگو کرے۔ اس لحاظ سے آج وجود باری پر بے شمار "سائنٹفک دلیلیں" دی جاسکتی ہیں جو موجودہ دور کے مطابق موثر اور کارگر ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ اوپر مذکور چار دلیلوں میں سے تیسری دلیل سائنٹفک قسم کی ہے۔ جو اصلاً امام ابوالحسن اشعریؒ سے منقول ہے[۲۳]

یہی باری تعالیٰ کے وجود کی بحث۔ اس کے بعد دوسری بحث باری تعالیٰ کی ذات (ماہیت) کے بارے میں ہے اور اس میں کافی اختلاف ہے۔ جن کی تفصیل موصوف نے اس طرح کی ہے۔

۱۔ باری تعالیٰ کی ذات دیگر تمام موجودات سے مختلف ہے اور وہ کسی کا مثل یا ہمسر نہیں ہے۔

المقصد الثانی: فی ان ذاته تعالی مخالفة لسائر الذوات فهو منزه عن المثل والند، تعالی عن ذلک علواً کبیراً۔

۲۔ اس بارے میں دوسرا موقف قدمائے متکلمین کا ہے کہ ذات باری تعالیٰ دیگر موجودات کے ہم مثل ہے۔ مگر وہ دیگر موجودات سے چار باتوں میں ممتاز ہے: وجوب، حیات، علم تام اور قدرت تامہ۔ وقال قدماء المتکلمین: ذاته تعالی مماثلة لسائر الذوات، وانما تمتاز عن سائر الذوات باحوال اربعة: الوجوب والحیاة والعلم التام والقدرة التامة۔

۳۔ ابوہاشم کے نزدیک وہ ان چاروں خصوصیات کے علاوہ ایک پانچویں خصوصیت سے بھی متصف ہے جو "الوہیت" ہے۔ وعند ابی هاشم یمتاز بحالة خامسة هی الموجبة لهذه الاربعة، نسمیها بالالهیة[۲۴]

مولف کتاب دوسرے اور تیسرے موقف کا رد کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اگر ذات باری میں دوسری مخلوق بھی شریک ہوجائیں تو اس سے (خالق اور مخلوق کے درمیان) ثنویت باقی نہیں رہے گی۔ نتیجہ یہ کہ باری تعالیٰ کا "مرکب" ہونا لازم ہوجائے گا۔ جو اس کے وجوب ذاتی کے منافی ہے[۲۵]



**ایک معتدل موقف** اس بحث کے مطابق پہلا موقف بالکل صحیح ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات اقدس دیگر تمام مظاہر و موجودات سے مختلف ہے۔ تو اس اعتبار سے اس کے جسمانی وجود کی نفی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ بغیر جسمانی وجود کے کسی چیز کا تصور میں آنا خود عقلی یا فلسفیانہ نقطہ نظر سے محال ہے۔ اب رہا دوسرا اور تیسرا موقف تو وہ اس لحاظ سے غلط اور مہمل ہے کہ باری تعالیٰ ہمارے اجسام ہی کی طرح ہے اور جہاں تک صفات کے اختلاف کا تعلق ہے تو وہ چار پانچ میں منحصر نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی بے شمار صفات ہیں جو مخلوقات کی صفات سے یکسر مختلف اور حیرت انگیز ہیں۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ نے تصریح کی ہے کہ باری تعالیٰ کی تمام صفات مخلوقات کی صفات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ اس کا جاننا ہمارے جاننے کی طرح نہیں ہے، اس کی قدرت ہماری قدرت کی طرح نہیں ہے، اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے، اس کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں ہے اور اس کا تکلم کرنا ہمارے تکلم کرنے کی طرح نہیں ہے[۲۶]

جب اتنا سب صحیح ہے تو پھر اسے صاحب جسم تسلیم کرلینے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے؟ جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل گزر چکی کہ بعض سلف صالحین "تشبیہ" کی حد تک اس کی جسمانیت کے قائل تھے۔ اس لحاظ سے اس قسم کی بات نہ کوئی بدعت ہے اور نہ ہی کوئی نقص یا عیب کی بات۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ جسم تو ہے مگر وہ دیگر اجسام کی طرح نہیں ہے اور سائنٹفک نقطہ نظر سے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ سائنس نہ تو "مادہ" کی حقیقت جانتی ہے اور نہ "اجسام" کی۔ اسی طرح اس نے استقرائی اعتبار سے ہماری معلوم شدہ کائنات کے تمام حقائق کا پتہ بھی نہیں لگایا ہے، ماورائے کائنات کے عجائب تک رسائی حاصل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔

الغرض ماہیت باری کے بارے میں اس اعتراف کے بغیر یہ پیچیدہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہماری حیرتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ لہذا اس سلسلے کے قدیم کلامی مسائل کو ایک دفتر پارینہ تصور

کر کے اسے تہہ کر دینا ہی بہتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "حدوث عالم" کے ذریعہ باری تعالیٰ کا وجود ثابت کرنا دین میں ایک بہت بڑا فتنہ بن گیا ہے، کیونکہ اس مردود نظریہ کی بنا پر خداوند عالم کا وجود ثابت ہونا تو درکنار وہ ایک معما اور چیستاں بن کر رہ گیا ہے اور سائنٹفک نقطہ نظر سے اس کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو "کچھ" نہ کہنا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، جو غیر واقعی اور غیر سائنٹفک ہے۔ چنانچہ اگلے صفحات میں قرآن اور حدیث کی بعض تصریحات کی روشنی میں باری تعالیٰ کی "جسمانیت" پر بحث کی گئی ہے۔

**وجود باری کی ایک سائنٹفک دلیل** جدید سائنسی اکتشافات کی بدولت کائنات کے بہت سے اسرار سربستہ منظر عام پر آچکے ہیں، جو خلاق عالم کے "تخلیقی رازوں" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان نئے حقائق کی روشنی میں خدا کے وجود پر نئے دلائل قائم کرنے کا دروازہ کھل گیا ہے۔ جن کے مقابلے میں قدیم فلسفیانہ دلائل ایک افسانہ معلوم ہوتے ہیں اور ان نئے دلائل کے ذریعہ جدید ذہن و دماغ کو متاثر کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر حدوث عالم ہی کے سلسلے میں وجود باری پر ایک نئی دلیل اس طرح قائم کی جاسکتی ہے کہ ہماری کائنات اربوں کہکشاؤں (گیلک سیز) پر مشتمل ایک انتہائی وسیع اور بے کراں کائنات ہے جو ایک دھماکے کے ذریعہ وجود میں آئی ہے، جیسا کہ "بگ بینگ تھیوری" کے طور پر جدید سائنس کا نظریہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قدر عظیم مادہ کہاں سے آیا اور اس میں دھماکہ کس نے کیا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ رب العالمین نے یہ مادہ اپنی عظیم ترین قدرت سے پیدا کیا (اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ) اور اس میں دھماکہ بھی اسی نے کیا (کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا) یعنی زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، جن کو ہم نے پھاڑ کر جدا کر دیا۔

اس اعتبار سے یہاں پر نہ صرف خداوند عالم کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ اس کی "خلاقیت"



اور اس کی عظمت و بزرگی بھی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قدر وسیع و عریض مادہ جو ناقابل قیاس حد تک انتہائی عظیم ہے، پیدا کرنا اس کی خلاقیت کی دلیل ہے اور پھر اس عظیم ترین مادے میں دھماکہ کرنا یا اس کو پھاڑ کر اربوں کہکشائیں اور ان گنت و لاتعداد ستارے و سیارے پیدا کرنا اس کی عظمت و بزرگی کا واضح ترین ثبوت ہے۔ اس اعتبار سے خالقِ ارض و سما کی زبردست قوت و عظمت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، جو متکلمین کے لغو نظریہ کے مطابق ایک معمولی ذرہ (جوہر یا ایٹم) یا اس سے بھی حقیر و کمترین وجود نہیں ہوسکتا۔ بھلا ایک ننھا سا ایٹم کیا کر سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

**صفات باری کا سائنٹفک ثبوت** پچھلی دلیل وجود باری کے سلسلے میں تھی۔ اب صفات باری کے ثبوت میں ایک سائنٹفک دلیل ملاحظہ ہو جس سے قدیم و جدید تمام فلاسفہ (منکرین خدا) اور خاص کر معتزلہ کا رد ہوتا ہے جو صفات باری کے منکر تھے۔

ہماری کائنات کا مادہ ابتداءً گیس کی شکل میں تھا (جیسا کہ سائنسی تحقیق ہے) اس کی تعبیر قرآنِ حکیم میں دھوئیں (دُخان) کے لفظ سے کی گئی ہے (ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ) مگر اس دخانی مادے سے مختلف خصوصیات رکھنے والے اجرام سماوی ہی نہیں بلکہ خود "مادے" ہی کی مختلف قسمیں وجود میں لانا ایک بہت بڑا کرشمہ اور خلاقیت کا مظہر ہے۔ مثلاً مادہ اور ضد مادہ، پلازما، سیاہ مادہ اور سیاہ سحابیہ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ ان اختلافات کی وجہ سمجھنے سے سائنس داں قاصر ہیں۔

اور پھر اس سے بھی بڑا کمال یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال نے اس دخانی یا گیسی مادے سے جو دراصل برقی لہروں کا مجموعہ ہے، ہائیڈروجن سے لے کر یورانیم تک ۹۲ عناصر بنا دئے، جن میں سے ہر ایک کی طبیعیاتی طور پر الگ الگ خصوصیات ہیں۔ ایک سے لے کر ۹۲ تک یہ تمام قدرتی عناصر تسلسل کے ساتھ کس طرح وجود میں آگئے؟ اس کی گرہ کشائی کوئی بھی سائنس داں نہیں کر سکتا اور پھر

ان "مردہ" عناصر میں زندگی کس طرح نمودار ہوگئی اور مادی مظاہر میں سماعت، بصارت، قدرت، علم، ارادہ اور تکلم وغیرہ وغیرہ صفات کس طرح ظاہر ہوگئیں؟ اس کی توجیہ کرنے سے پوری دنیائے سائنس عاجز ہے۔ کیونکہ مفرد عناصر میں یہ خصوصیات ناپید ہیں اور یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان صرف اشیاء کی ظاہری خصوصیات ہی دریافت کر سکتا ہے، ان کے باطنی کوائف کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہٰذا ان غیر مادی صفات کا ظہور بغیر کسی خلاق ہستی کے آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس مظہر قدرت کے ظہور سے یہ ابدی حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی حیرت انگیز ہستی ضرور موجود ہے جو مذکورۂ بالا تمام صفات سے متصف ہے۔ ورنہ ایک سمیع و بصیر ہستی کے وجود کے بغیر سماعت و بصارت کا ظہور نہیں ہو سکتا، ایک قادر مطلق ہستی کے بغیر قدرت یا طاقت نمودار نہیں ہو سکتی، ایک عاقل و باشعور وجود کے بغیر عقل و شعور ظاہر نہیں ہو سکتے، ایک علیم و خبیر پیکر کے بغیر علم وجود میں نہیں آسکتا و قس علیٰ ذلک۔

اس اعتبار سے ایک انسان یا ایک باشعور و با ارادہ ہستی میں جتنی بھی صفات اور جتنے بھی کمالات نظر آتے ہیں وہ ایک مافوق الطبیعی وجود کا پرتو ہیں۔ اگرچہ خالق اور مخلوق میں کوئی مشابہت نہیں ہے مگر یک گونہ مناسبت ضرور ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح دیکھ اور سُن رہا ہے جس طرح انسان دیکھتا اور سُنتا ہے، یا یہ کہ اس کا علم اور اس کی قدرت بھی انسان ہی کی طرح ہے۔ غرض وہ لامحدود قوتوں والا اور ہمہ داں و ہمہ بیں ہے۔ وہ کھاتا پیتا نہیں ہے، وہ سوتا نہیں ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے اور سب پر نظر رکھے ہوئے انہیں سہارا دے رہا ہے اگر وہ اپنی مخلوق سے نظر ہٹالے تو پوری کائنات درہم برہم ہو جائے گی۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ | اللہ یقیناً آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے |
| أَن تَزُولَا ۚ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا | ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ اگر وہ اپنی جگہ |



| | |
|---|---|
| مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ | سے ہٹ گئے تو اس کے بعد انہیں کوئی بھی |
| حَلِيمًا غَفُورًا (فاطر: ۴۱) | تھام نہیں سکتا۔ یقیناً وہ (اپنے بندوں کے |
| | لئے) بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔ |

### افعال الٰہی کا سائنٹفک ثبوت

وجود باری اور صفات باری کے اثبات کے بعد اب افعالِ باری کا سائنٹفک ثبوت یہ ہے کہ اس نے ایک "مشترکہ" مادے سے مختلف خصوصیات والے عناصر و جواہر پیدا کئے جو ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ پھر ان عناصر کی "ترکیب" سے مختلف مظاہر و موجودات کو وجود بخشا۔ پھر ان میں سے بعض کو جمادات، بعض کو سماوات اور بعض کو نباتات و حیوانات کی شکل دے دی اور ان سب کو رنگ برنگے روپ عطا کئے اور ان کے خصائص میں بوقلمونی پیدا کر دی، جو یقیناً خلاقیت و ربوبیت کے معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس اعتبار سے ہماری اس کائنات میں جتنی بھی اشیاء اور ان کی عجیب و غریب خصوصیات ہیں وہ سب "افعال الٰہی" کی کرشمہ سازیاں ہیں، جن کی صحیح حقیقت و ماہیت سمجھنے سے جدید سائنس باوجود اپنی ہمہ گیر ترقی کے عاجز و بے بس ہے اور یہ باری تعالیٰ کی "الوہیت" کی ایک ناقابل تردید دلیل ہے۔ یعنی افعال الٰہی کی تعلیل سے انسان عاجز ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے ہائیڈروجن اپنی طبیعت کے لحاظ سے (مفرد طور پر) ایک جلنے والی گیس ہے اور آکسیجن اپنی اصل طبیعت کی رو سے چیزوں کو جلانے میں مدد دینے والی گیس ہے۔ مگر ان دونوں کے تعامل سے پانی جیسی بجھانے والی چیز کس طرح وجود میں آگئی؟ اس کی توجیہ کوئی بھی سائنس داں نہیں کر سکتا۔ یہی حال دیگر اشیاء کا بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہ پوری کائنات "جادو کی نگری" معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ "اِلٰہ" کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ: وہ ہستی جو (اپنے افعال میں) حیرت انگیز ہو۔[1]

خلاصہ یہ کہ کلامی نقطہ نظر سے مسئلہ توحید میں جو بحث کی جاتی ہے، اس کا دائرہ ذات باری، اس کی

صفات اور اس کے افعال ہیں اور یہ تینوں امور بغیر کسی الجھاوے کے سائنٹفک نقطہ نظر سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے میں اور بھی بہت سے نئے نئے دلائل جدید سے جدید تر سائنسی انکشافات کی روشنی میں دئے جا سکتے ہیں، جن کے ذریعہ ایک طرف ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف فکری و نظریاتی گمراہیوں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جدید سائنسی تحقیقات کو زیر بحث لاکر جدید علم کلام کی تدوین کرنا ضروری ہے، جس کے باعث نوع انسانی کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔ (نحل : ۸۹)

اور ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب اتار دی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور وہ اہل اسلام کے لئے ہدایت رحمت اور خوش خبری ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (حدید : ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو ہر دور میں کھلے کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی اتار دی ہے۔ تاکہ لوگ (جادہ) اعتدال پر قائم رہیں۔

## مراجع

[1] وولڈ بک انسائیکلوپیڈیا: ۹/N، لندن، ۱۹۹۶ء [2] حوالہ مذکور [3] دیکھئے آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا، جلد نمبر ۸ صفحہ نمبر ۱۳۲، مطبوعہ ۱۹۹۳ء [4] Guid to Modern Thought. by C.E.M. Joad. London. P.108 [5] تفصیل کے لئے دیکھئے قدیم فلکیات کی کتابیں "تصریح" اور "شرح چغمینی" مطبوعہ دیوبند [6] دیکھئے موافقۃ صحیح المنقول علامہ ابن تیمیہ ۱۰/ ۱۸۹ - ۱۹۰ [7] جدید اصطلاح میں ایٹم [8] جدید



اصطلاح میں "سالمہ" یا مالیکیول [9] الاقتصاد فی الاعتقاد ابو حامد غزالی، ص ۱۹، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۸۳ء [10] حوالہ مذکور ص ۵ [11] المستصفیٰ، ابو حامد غزالی: ۱/ ۱۶۲ - ۱۶۳، تحقیق ڈاکٹر حمزہ بن زہیر حافظ، مطبوعہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ [12] عرض سے مراد وہ چیز ہے جو اپنے وجود کے لئے کسی جگہ کی محتاج ہو جس کے ساتھ وہ قائم رہ سکے، جیسے رنگ، بو اور ذائقہ وغیرہ۔ چنانچہ ان اعراض کے قیام کے لئے ایک مادی پیکر (جسم) ضروری ہے [13] وجود میں لانے والا، صانع، خالق [14] فعل کو وقوع میں لانے والا [15] الفصل فی الملل والاہواء والنحل، ابن حزم: ۲/ ۱۱۷، دار الفکر ۱۹۸۰ء [16] بمعنی مادہ [17] الفصل فی الملل والاہواء والنحل: ۲/ ۱۱۹ [18] مقدمہ ابن خلدون: ۲/ ۲۱۲، موسسۃ الکتب الثقافیہ بیروت ۱۹۹۴ء [19] خلاصۃ از الاربعین فی اصول الدین، ص ۱۴۹ - ۱۵۰، مکتبہ الکلیات الازہریہ مصر [20] ممکن وہ چیز جس کا وجود و عدم دونوں برابر ہوں۔ یا وہ شے جو اپنے وجود کے لئے کسی دوسرے کی محتاج ہو اور اس کا متقابل واجب ہے جو ہمیشہ سے قائم ہو، یعنی باری تعالیٰ [21] الموقف فی علم الکلام، عضد الدین عبد الرحمٰن ایجی: ص ۲۶۶ بیروت [22] حوالہ مذکور [23] دیکھئے کتاب اللمع، ص ۱۸ - ۱۹، المکتبۃ الازہریۃ للتراث مصر [24] الموقف فی علم الکلام، ص ۲۶۹ [25] مرجع سابق [26] شرح الفقہ الاکبر، ملا علی قاری، ص ۴۹ - ۵۰، دار الکتاب العلمیہ، بیروت [27] دیکھئے مفردات القرآن النہایۃ فی غریب الحدیث اور لسان العرب۔

# سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات پر ایک نظر

از ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ٭

"پروفیسر خلیق احمد نظامی برصغیر کے بہت ممتاز مورخ تھے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ اور معارف کی مجلس ادارت کے بڑے باوقار اور اہم رکن تھے، ہم کو افسوس ہے کہ ان پر معارف میں کوئی اچھا مضمون شایع نہیں ہو سکا۔ ذیل کے مقالے میں ان کی تصنیف کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو کہیں کہیں ناقدانہ بھی ہو گیا ہے جس کا حق مضمون نگار کو تھا۔ تاہم اگر کسی صاحب علم کو ان کے تجزیے سے اتفاق نہ ہو تو ان کی معروضات کی اشاعت کے لئے معارف کے صفحات حاضر ہیں" (ض)

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کا اولین حصہ "دہلی سلطنت" کے نام سے معروف ہے۔ یہ دور جو تقریباً تین سو برس (۱۲۰۶ - ۱۵۲۶ء) میں پھیلا ہوا ہے، مسلمانوں کی عام سیاسی تاریخ بالخصوص برصغیر میں ان کی حکومت کے قیام و استحکام کے نقطہ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ سندھ میں عربوں کی حکومت سے قطع نظر شمالی ہندوستان یا اس ملک کے ایک بڑے حصہ میں مسلم حکومت کے قیام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ سلاطین دہلی نے اس دور میں حکومت کی جو پالیسی وضع کی یا نظم و نسق کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بعد کے حکمرانوں یا مغل بادشاہوں کے لئے نمونہ ثابت ہوا۔ اسی طرح اس عہد میں اس سرزمین میں اسلامی علوم و فنون کے فروغ اور مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی اداروں کے

٭ ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔



قیام کی جو روایتیں قائم ہوئیں وہی بعد کے زمانے میں مزید وسیع و مستحکم ہوئیں۔ سیاست و حکومت کی نسبت سے اس حکومت کی جو دینی رہی ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ بہرحال مسلم ہے، لیکن اسی کے ساتھ سلاطین کی مذہب سے وابستگی، ان کی حکومت کا شریعت سے تعلق، اسلامی علوم و فنون کے فروغ میں ان کی دلچسپی، علما و مشائخ سے تعلقات اور انتظامی معاملات میں ان سے مشورہ طلبی جیسے مسائل بھی بہت اہم ہیں، ان کا مطالعہ و تجزیہ اس لحاظ سے اور اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے اس دور کی حکومت کی خصوصیات، حکمرانوں کے انداز سیاست و طرز حکمرانی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلاطین دہلی نے اپنی حکومت کی بنیاد شاہی نظام پر رکھی، درباری زندگی و حکومت کے کاروبار میں تیموری اصول جہاں بانی و ایرانی روایات کو دخیل بنایا اور کسی حد تک مقامی اثرات بھی قبول کئے، لیکن بہرحال وہ مسلمان تھے اور اسلامی اصول و عقائد پر یقین رکھتے تھے۔ اسلامی شریعت کی بالادستی کے قائل تھے اور اس کے تئیں انہوں نے ادب و احترام کا جذبہ اختیار کیا۔ ان سب سے اہم یہ کہ آئین حکومت کے ترکیبی عناصر میں اسلامی قوانین و ضوابط بھی شامل تھے۔ اس لحاظ سے بھی سلاطین کے فکری میلانات اور ان کی حکومت میں شریعت کی حصہ داری کا مطالعہ بڑی معنویت و افادیت رکھتا ہے۔ یہاں اس جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد سلطنت کی سیاسی سرگرمیوں، فوجی مہمات و فتوحات، درباری زندگی کی تفصیلات اور انتظامی معاملات پر خامہ فرسائی اسی زمانہ سے جاری ہے، لیکن اس دور میں مذہبی افکار کی نشو و نما، حکمرانوں کے فکری رجحانات اور ان کی حکومت میں شریعت کے عمل دخل پر معلومات فراہم کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے پر بہت کم توجہ دی گئی۔ اس اعتبار سے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی معروف تصنیف "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" تاریخ کی اس نئی سمت میں ایک

وقیع و قابل قدر کوشش ہے۔ اس تالیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے صاحب کتاب خود لکھتے ہیں:

"اس دور میں جتنی بھی تاریخیں لکھی گئیں ہیں ان میں ایرانی نظریہ تاریخ کے زیر اثر میدان جنگ کے حالات اور سیاسی واقعات کی کثرت ہے۔ پھر بعض تاریخیں سیاسی مقاصد کے پیش نظر لکھی گئی تھیں اور ان کے ماخذ فتح نامے تھے جو زمانہ حال کی حکومتوں کے COMM UNIQUE کی طرح قرون وسطی کی حکومتیں تیار کراتی تھیں اور اس طرز پر لکھی ہوئی سیاسی تاریخوں سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو صرف اس دور کے مذہبی لٹریچر، مشائخ کے ملفوظات، مشاہیر کے مکتوبات وغیرہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ سلاطین کی جو تصویر بنائی جائے اس کے رنگ صرف سیاسی مورخوں ہی سے حاصل نہ کئے جائیں بلکہ سماج کے جس طبقہ کی رائے ان کے متعلق حاصل ہو جائے اس کا پتہ لگایا جائے۔" [۱]

اس سیاق میں اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کی تیاری میں نہ صرف روایتی ماخذ (معاصر و غیر معاصر تاریخی کتب) سے استفادہ کیا گیا ہے، بلکہ فرامین و خطوط کے مجموعے، مکتوبات، صوفیاء و علماء کے تذکرے اور ملفوظات وغیرہ بھی اچھی طرح استعمال کئے گئے ہیں اور انہی کی مدد سے زیر بحث مسئلہ پر ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو متعلقہ ماخذ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے یا ان کی غلط ترجمانی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ نامور مورخ پروفیسر محمد حبیب اس کتاب کے تعارف میں رقمطراز ہیں:

"میرے عزیز ساتھی خلیق احمد صاحب نظامی کی تصانیف ہمیشہ تمام ممکن الحصول قلمی و مطبوعہ ماخذ کے گہرے اور ناقدانہ مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہیں، وہ بڑی تلاش اور محنت سے مواد فراہم کرنے کے بعد ماحول کے پس منظر میں حالات کا جائزہ لیتے اور واقعات کی توجیہ کرتے ہیں۔ پیش نظر تصنیف بھی ان خصوصیات کی حامل ہے، تاریخ ہند سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے



اس کا مطالعہ ناگزیر ہے، خلیق صاحب نے اس وقت جس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ہے اس کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، یہ وہ موضوع ہے جو معاصرین تک نے غلط پیش کیا ہے اور متاخرین نے تو غلط سمجھا ہی ہے۔ خلیق صاحب کی اس تصنیف سے ایک نہایت ہی متوازن نقطۂ نظر مل گیا ہے جس سے معاصرین اور متاخرین دونوں کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ممکن ہے۔" [۲]

عہد سلطنت میں سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ - ۱۲۱۰ء) تا ابراہیم لودی (۱۵۱۷-۱۵۲۶ء) معروف و غیر معروف ۱۹ حکمراں گزرے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں ان تمام کے مذہبی افکار اور نظم حکومت پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بالعموم معروف سلاطین کے عہد کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کتاب کا آخری حصہ جو لودی سلاطین سے تعلق رکھتا ہے بہت ہی مختصر ہے۔ سلطان ابراہیم لودی کے عہد سے متعلق بحث محض دو صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب میں اصل ابواب سے قبل اس کے مباحث کے تعارف کے طور پر بڑے اہم امور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ ہیں: سلاطین کے مذہبی افکار کی نشو و نما، تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کا مقام، سلطنت دہلی میں مذہب کی حیثیت، سلطنت دہلی میں غیر مسلم خلافت اور سلاطین دہلی، یہ ابتدائی حصہ (جو تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے) مفید معلومات سے پر ہے اور اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار پر مصنف کی گہری نظر کا شاہد ہے۔ ان اولین مباحث کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ "افتتاح سخن" کے تحت فاضل مصنف نے پہلے یہ بجا طور پر واضح کیا ہے کہ کسی (بالخصوص سیاسی شخصیات) کے مذہبی افکار و خیالات کا مطالعہ جتنا اہم و دلچسپ ہے اتنا ہی دشوار و پرخطر بھی۔ اس لئے کہ انسان کے ظاہری حالات و عملی مظاہر اس کے فکر کی گہرائی تک پہنچنے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت نہیں ہوتے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں:

"جذبات واحساسات کی دنیا تک پہنچنے میں کتنی ہی پُر پیچ وادیاں ہیں جو قطع کرنی پڑتی ہیں، بعض اوقات تو اس جدوجہد میں علم نفسیات کو بھی اپنی درماندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور "پائے مرا رفتار نیست" کہتے ہوئے ہی بن پڑتی ہے۔ متضاد کیفیات، اثرات اور مطالبات کے ہجوم میں انسانی فکر وعمل کے اصل محرکات کی نشاندہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں، جب بادشاہوں کے مذہبی جذبات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں اس لئے کہ ان کے اخلاقی ضابطے عوام سے کچھ مختلف ہوتے ہیں، وہ کبھی مذہب کا سہارا لے کر جیتے ہیں، کبھی سیاست کو اپنا رہبر بناتے ہیں۔" [۳]

اسی ضمن میں پروفیسر نظامی صاحب نے پیش نظر مطالعہ کی اس پیچیدگی کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ سلاطین دہلی کے افکار وطرز عمل کو کس پیمانہ پر جانچا جائے۔ آیا خلفائے راشدین کے اصول ونمونہ پر یا خود سلاطین کے اپنے یا قریبی زمانہ کے حکمرانوں کے فکری رجحانات وعملی اقدامات کی روشنی میں [۴]۔ راقم کے خیال میں ایک تیسرے پہلو سے بھی یہ مطالعہ بامعنی ومفید ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے عباسی خلافت کے زوال کے بعد مرکزی ایشیا اور دنیا کے بعض دوسرے حصوں میں قائم شدہ آزاد مسلم ریاستوں کی سیاسی ومذہبی حالت اور ان کے سربراہوں کے افکار وخیالات کی روشنی میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی مسلم حکومت کا جائزہ، اصلاً اسی سے اسلامی تاریخ یا معاصر اسلامی دنیا میں دہلی سلطنت کا درجہ متعین ہوسکے گا۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ خود صاحب کتاب نے سلاطین دہلی کے مذہبی افکار کے مطالعہ کے لئے کون سا پیمانہ اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی لیکن کتاب کے مشتملات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے خاص طور سے اسلام کے سیاسی احوال وضوابط اور مسلم نظام حکومت کے پیمانے پر دہلی سلطنت کو ناپنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس عہد میں دوسرے ملکوں (بشمول ہندوستان) کے عام سیاسی



حالات بھی ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان کے اس تبصرہ سے بھی یہی تاثر ابھرتا ہے کہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات کے مطالعہ میں بڑی دشواریاں ہیں، لیکن اس کے لئے دونوں پیمانے ناگزیر ہیں۔ اس لئے کہ اس سے تاریخ اسلام میں ان سلاطین کے مقام کے تعین میں مدد ملتی ہے اور دوسرے تاریخ عالم میں ان کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے [۵]۔

مقدمہ میں زیر بحث موضوع پر مطالعہ وتحقیق کے لئے اس نکتہ پر بھی خاص زور دیا گیا ہے کہ سلاطین کے مذہبی افکار کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس ماحول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جس میں ان کی نشوونما ہوئی اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا خاص عوامل تھے جنھوں نے ان کی فکر وعمل کی راہوں کو متعین کرنے میں اہم حصہ لیا۔ صاحب کتاب کے خیال میں ایک جانب یہ ذہن میں رہے کہ یہ سلاطین مسلمان تھے۔ اسلامی تعلیمات و روایات سے بھی روشناس تھے۔ دوسری جانب ان سلاطین کے اصل وطن غور کے مذہبی وسماجی حالات، ترک افغان قبائل کے مذہبی معتقدات وسماجی رسوم، ساسانی حکمرانوں کے درباری آداب واصول جہاں بانی اور خود ہندوستان کے سماجی وسیاسی حالات اور ہندوؤں سے اختلاط کے نتائج بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے چاہئیں۔ ان سب کے علاوہ ان کے خیال میں صوفیہ ومشائخ کی تعلیمات نے جس طرح یہاں کے عوام وحکمران طبقہ دونوں کو متاثر کیا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا [۶]۔ اس طرح پروفیسر نظامی صاحب کی رائے میں سلاطین کی ذہنی تعمیر اور ان کے افکار کی نشوونما میں یہ تمام عوامل کارفرما رہے ہیں۔

جہاں تک اس کتاب (جو ۱۴ ابواب میں منقسم ہے) کے مباحث کی جامعیت کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر سلطان کے ضمن میں اس کی ابتدائی زندگی، تعلیم وتربیت، ذاتی زندگی میں مذہب سے وابستگی، علما ومشائخ سے تعلقات، امور حکومت میں شریعت پر عمل آوری کی

نوعیت، عوام کی دینی و اخلاقی تربیت، تعمیر مساجد، قیام مدارس اور رفاہ عامہ کے کام میں ان کی دلچسپی مقامات مقدسہ سے عقیدت، خلافت بغداد سے تعلق اور غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب جو اصلاً سلاطین کے مذہبی رجحانات کے مطالعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ عہد سلطنت کے سیاسی، سماجی و تمدنی حالات، اصول حکمرانی و نظم حکومت اور سلاطین کی دینی و علمی خدمات پر بڑی مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے خاص طور سے ذاتی زندگی میں مذہب سے وابستگی، مذہبی امور میں سلاطین کی دلچسپی، علماء و صوفیہ سے ان کے تعلقات، امور حکومت میں ان سے مشورہ طلبی، احترام شرع اور نفاذِ شریعت کی روشنی میں سلاطین کے مذہبی رجحانات متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سب سے زیادہ اہمیت انھوں نے علماء و مشائخ سے سلاطین کے تعلقات اور ان کے تئیں ان حکمرانوں کے رویہ کو دیا ہے۔ ان کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلاطین کی زندگی یا ان کی حکومت میں مذہب کا جو کچھ اثر رہا ہے۔ وہ زیادہ تر صوفیہ کی صحبت یا ان سے تعلقات کا ثمرہ تھا۔ اسی کے ساتھ کتاب کے مباحث سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ ان سلاطین کو عوام میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جن کو صوفیہ سے گہری عقیدت تھی اور جو ان سے قریب رہے اور جنھوں نے ان سے تعلقات قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ تاثرات غالباً صاحب کتاب کی تصوف سے خاص دلچسپی اور اس میں ان کے انہماک کا نتیجہ ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس کتاب میں سلاطین کے علماء سے تعلقات ان سے حصول قربت کی خواہش و کوشش اور مختلف معاملات میں ان سے تبادلہ خیال کی بھی بہت سی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن اسی کے ساتھ بار بار یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلقات محض رسمی تھے اور سلاطین کی زندگی یا ان کے نظم حکومت پر ان کے اثرات برائے نام تھے۔ اس طرح کے بیانات سے ان حقائق کی روشنی میں اتفاق مشکل ہے کہ سلاطین



عام طور پر علماء کی صحبت پسند کرتے اور ان سے مشورہ طلب کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے بعض سلاطین نے اہم و مختلف فیہ معاملات میں اقدام سے قبل نہ صرف علماء کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھا بلکہ ان پر عمل بھی کیا اور اگر علماء نے از خود کسی مسئلہ میں شریعت کے موقف کو واضح کیا تو اسے بھی قابلِ توجہ و عمل تصور کیا۔ خود زیر مطالعہ کتاب میں مختلف سلاطین کے دور سے متعلق اس نوع کی متعدد مثالیں موجود ہیں[38] اسی طرح سلاطین و مذہب اور حکومت و شریعت کے تعلق پر کتاب کے مباحث سے یہ تاثر بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اس کی حیثیت رسمی زیادہ تھی۔ کچھ سلاطین ذاتی زندگی میں مذہبی تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔ دین داری و پابندی شریعت کی مثالیں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں لیکن سیاست و حکومت پر اس کے اثرات ظاہر نہیں ہوئے[39] خود صاحب کتاب کے الفاظ میں:

> "سلطنت بالکل غیر اسلامی سیاست کی پیداوار تھی اور سلاطین دہلی گو مسلمان تھے لیکن اسلام کے نمائندے نہ تھے ان کی انفرادی زندگی میں مذہب کو کوئی بھی درجہ حاصل رہا ہو، لیکن انھوں نے سیاسی معاملات میں مذہب سے روشنی حاصل نہیں کی"[40]

گو ان تاثرات اور کتاب کے بعض دیگر مندرجات کے بارے میں مصنف کے نتائج فکر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں یہ اولین تالیف ہے جس میں مستند ماخذ کے حوالہ سے سلاطین دہلی کے مذہبی افکار، ذاتی زندگی میں مذہب سے وابستگی اور شریعت کے تئیں ان کی حکومت کے رویہ پر تفصیلی مباحث ملتے ہیں۔ صاحب کتاب نے ان مسائل سے بھی تعرض کیا ہے جن کا اس مطالعہ کے دوران ایک مورخ یا محقق کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پیش نظر کتاب کے مباحث کا ایک مفید حصہ (جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا) سلاطین کی ذاتی زندگی کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ ہے کہ ان میں کہاں تک مذہب سے وابستگی پائی جاتی

تھی اور روزمرہ کے معمولات میں وہ کس حد تک شریعت کے پابند تھے۔ ان تفصیلات سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے کہ نماز و روزہ اور دیگر فرائض کی پابندی، شعائر اسلام کے احترام، محرمات و منکرات سے اجتناب، مذہبی شخصیات سے تعلقات اور دینی امور میں دلچسپی کے اعتبار سے ان سلاطین کا کیا طرز عمل رہا ہے۔ مثال کے طور پر سلطان التمش (۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ء) کے بیان میں دینی امور میں سلطان کی دلچسپی، نماز کی پابندی، شب بیداری، وعظ و ارشاد کی مجالس میں شرکت، علماء و مشائخ سے عقیدت و تعلق سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں[۱۱] اسی کے ساتھ مصنف گرامی نے یہ تبصرہ بھی فرمایا ہے کہ سلطان کی مذہبیت یا مذہبی امور میں دلچسپی کے اثرات سیاست و حکومت میں ظاہر نہ ہو سکے یا بالفاظ دیگر نماز روزہ کی پابندی، وعظ و تذکیر کی مجالس کا احترام اور علماء و مشائخ سے قربت اسلامی احوال و تعلیمات کے مطابق شاہی دربار کے ماحول اور انداز حکمرانی کو تبدیل نہ کر سکی۔[۱۲] دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب میں اسی طرح کی رائے بعض دیگر سلاطین کے ضمن میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کتاب کے فاضل تعارف نگار (پروفیسر محمد حبیب صاحب) نے اس کے مشمولات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بعض سلاطین کی مذہبیت نہ تو ان کی حکومت کے کاموں میں معاون ثابت ہوئی اور نہ کسی سلطان کی گرتی ہوئی حکومت کو بچا سکی، خود ان ہی کے الفاظ میں:

"میں نظامی صاحب سے متفق ہوں کہ التمش صوم و صلوٰۃ کا بڑا پابند تھا اور اس کے روابط صوفیائے وقت سے بھی نہایت عقیدت مندانہ تھے۔ لیکن اس تقدس نے نہ تو اس کے متقی لڑکے کو کوئی مدد بہم پہنچائی اور نہ بلبن ہی کو اپنے آقا کا خون بہانے سے باز رکھا۔ بلبن کی مذہبی رسوم کی پابندی بھی بلبن کے لئے مفید ثابت نہ ہوئی۔ ... محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات بھی اس مخالفت کو فرو نہ کر سکے جو اس کے حکمت عملی کے نتیجے کے طور پر وجود میں آئی تھی، فیروز شاہ کی غیر معمولی مذہبیت نے اس کی شہرت کو تو خوب ترقی دی لیکن روز بروز کمزور ہوتی ہوئی حکومت کو اس سے کوئی سہارا نہ مل سکا"[۱۳]



یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام دین و سیاست میں تفریق روا نہیں رکھتا، وہ اپنے اصول و ضوابط کو اپنے ماننے والوں کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر دائرہ میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی مسلم حکمراں اپنی دین داری و مذہبیت کو صرف ذاتی زندگی تک محدود رکھتا ہے تو اسے اس کے تصور مذہبیت کا نقص کہا جائے گا۔ اسے سیاست و حکومت کے دائرہ میں دین داری یا مذہبیت کی بے اثری یا حکومت کے کام میں شریعت کے عمل دخل کی عدم معنویت و افادیت سے تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح کسی دین پسند سلطان کی حکومت کی کمزوری اور اس کی دین داری میں رشتہ تلاش کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ سلطنت کی پائیداری و کمزوری یا حکومت کے استحکام و عدم استحکام کے اپنے اسباب و عوامل ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ دینی ذہن رکھنے والا سلطان حکومت کو مضبوط و مستحکم رکھنے میں بھی پوری طرح کامیاب ہو۔ اصل چیز جو دیکھنے اور پتہ لگانے کی ہے وہ یہ ہے کہ دین پسند سلاطین نے نجی زندگی کے ساتھ عوامی زندگی یا سیاست و حکومت کے میدان میں دین و شریعت کے تقاضوں کو پورا کیا کہ نہیں۔ اگر کیا تو عوام کو اس سے کتنا فائدہ پہنچا یا یہ کہ انتظامی امور میں اسلامی اصول و ضوابط پر عمل آوری حکومت کی کارکردگی اور عام لوگوں کی بھلائی کے اعتبار سے کس قدر مفید ثابت ہوئی۔

پیش نظر کتاب میں سلاطین و علماء کے تعلقات پر بہت تفصیلی بحث ملتی ہے۔ تقریباً ہر سلطان کے ضمن میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مباحث سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ سلاطین بالعموم سفر و حضر میں علماء کی صحبت پسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بہت سے سلاطین کا دربار علماء و فضلاء کا بہترین مرکز بن گیا تھا۔ ان سے لازمی طور پر اس دور میں علمی و دینی سرگرمیوں

کو فروغ ملا۔ ان علماء میں مفسر قرآن و شارح حدیث بھی تھے اور ترجمان شریعت بھی۔ ان میں وعظ و تذکیر میں دلچسپی لینے والے بھی شامل تھے اور مسند درس و تدریس کو زینت بخشنے والے بھی، ان کی دینی و علمی سرگرمیوں کے علاوہ کتاب کے مباحث سے خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سلاطین نے نظم حکومت میں علماء کے اثرات کو کس حد تک قبول کیا اور سیاست و حکومت کے کاموں میں انہیں کہاں تک دخیل بنایا۔

علماء میں جو سلطان سے زیادہ قریب ہوئے یا دربار سے منسلک رہے اور حکومت کی مقررہ ذمہ داریاں انجام دیتے رہے انہیں عام طور پر "درباری علماء" کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں صاحب کتاب کا تاثر یہ ہے کہ اہل اقتدار سے قربت کی وجہ سے یہ علماء جرأت فکر، حق گوئی و بے باکی کی صفت سے عاری ہوگئے تھے۔ علماء کے تئیں سلطان التمش کے رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

"علماء و مشائخ سے تعلقات کے باعث التمش کا دائرہ اقتدار بہت بڑھ گیا تھا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حکومت وقت سے تعلق سے علماء کے کردار پر نہایت خراب اثر پڑا۔ ان کی جرأت فکر، بصیرت دینی، حق گوئی و بے باکی سب درباری ماحول کی نذر ہوگئی۔"[۱۴]

اس کے بالمقابل سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء) کے طرز عمل کو سراہتے ہوئے مصنف گرامی نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ سلطان نے علماء کو سیاسی معاملات سے دور رکھا اور انہیں دینی و علمی مشاغل میں لگایا اور اس کا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان میں جرأت و حق گوئی پیدا ہوئی اور ان کا وقار بلند ہوا۔ خود صاحب کتاب کے الفاظ میں:

"اسلامی ہند کی تاریخ میں علاء الدین خلجی کا یہ کارنامہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا کہ اس نے علماء کو گندی سیاست سے نکال کر علمی و مذہبی کاموں میں لگایا گو اس عمل کا محرک جو جذبہ تھا وہ



سیاسی تھا لیکن اس کے اثرات علماء کے کردار و عادات پر بہت اچھے مرتب ہوئے۔ وہ سیاست کا میدان چھوڑ کر اصلاح و تربیت کے کاموں کی طرف رجوع ہوگئے۔ چنانچہ عہد علائی کے علماء اپنے کردار کی بلندی اور جذبہ حق گوئی میں بے مثال تھے۔ ان کے پیشرو علماء کیقباد جیسے کمزور اور مرنجان مرنج سلطان کے سامنے حق گوئی کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن اس دور کے علماء علاء الدین جیسے جابر اور سخت گیر بادشاہ کے سامنے سچی بات کہہ سکتے تھے۔"[۱۵]

اس نقطہ نظر کو خود اس کتاب کے مباحث کی روشنی میں قبول کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے سلطان کی ہر بات (خواہ صحیح ہو یا غلط) میں ہاں میں ہاں ملانے والے (یا اس وقت کی اصطلاح میں علمائے سوء) ہر دور میں اور ہر قبیلے کے علماء میں (انہیں دربار سے قریب یا حکومت انتظامیہ میں شریک رہنے والے علماء کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ درباری علماء میں ایسے لوگ بآسانی مل جاتے تھے۔ مزید براں زیر مطالعہ کتاب ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جرأت مند و حق گو علماء ان کی عام جماعت میں بھی پائے جاتے تھے اور دربار و مرکز اقتدار سے قریب رہنے والے علماء میں بھی۔ عہد سلطنت کے اس قبیلے کے علماء میں مثال کے طور پر سید نور الدین مبارک غزنوی، قاضی سعد و قاضی عماد، قاضی مغیث الدین، قاضی ضیاء الدین سنامی، قاضی محی الدین کاشانی، سید جلال بخاری، میاں عبداللہ اجودھنی۔ سید عبدالوہاب بخاری وغیرہم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایسے علماء بھی شامل ہیں جو معاصر سلطان سے بہت قریب تھے اور حکومت و انتظامیہ سے بھی منسلک تھے۔ دوسرے یہ بات بھی بہت زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ سلطان علاء الدین خلجی نے علماء و مذہبی شخصیات کو سیاست سے بالکل الگ تھلگ رکھا اور انہیں حکومت کے معاملات میں دخیل نہیں ہونے دیا۔ خود پیش نظر کتاب کے مندرجات سے یہ

واضح ہوتا ہے کہ عہد علائی میں دربار سے منسلک رہنے والے علماء کی تعداد میں اضافہ ہوا[16] اور محکمۂ قضاء، افتاء و احتساب میں ان کی تقرری بدستور جاری رہی اور اس باب میں سلطان کا رویہ اپنے پیش روؤں سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔ اس سے اہم یہ کہ علماء سے حصول قربت میں دلچسپی کا سیاست و حکومت کے معاملات میں ان سے مشورہ طلبی کی روایت اس دور میں بھی باقی رہی۔ قاضی مغیث سے علاء الدین کا طویل مکالمہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ، رشوت ستانی کی سزا، بیت المال میں سلطان اور ان کے گھر والوں کے حقوق جیسے اہم مسائل اس میں زیر بحث آئے تھے[17] مزید براں اس بات کے بھی واضح ثبوت ملتے ہیں کہ سلطان نے اپنی حکومت کے لئے نہ صرف علماء و مشائخ کی حمایت و ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ انہیں انتظامیہ سے بھی منسلک کرنا چاہا لیکن چشتی سلسلہ کے صوفیہ اپنے مرشد کے ہدایت کے مطابق اس کے لئے راضی نہ ہوئے[18] اس کے علاوہ اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں (جو زیر مطالعہ کتاب میں بھی مذکور ہیں) کہ سلطان علاء الدین نے سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے خط کے ذریعہ رابطہ قائم کیا، امور سلطنت میں ان سے رہنمائی طلب کی اور اہم مواقع بالخصوص بعض فوجی مہمات کے دوران آپ سے دعاؤں کی درخواست کی۔ شیخ نے اگرچہ کار شاہی سے بے تعلقی ظاہر کی لیکن سلطان کو یہ یقین دلایا کہ وہ ان کے لئے دعا کرتے رہیں گے[19] دوسرے سلسلے کے بعض صوفیہ (قاضی عالم دیوانہ، بوعلی شاہ قلندر پانی پتی اور شیخ رکن الدین ملتانی) سے بھی سلطان نے قربت حاصل کرنے کی کوشش کی اور انہیں تحفے و نذرانے بھیجتے رہے[20] مختصر یہ کہ اس عہد کے سماج میں علماء و مشائخ کو جو اہمیت و وقعت حاصل تھی اور بعض انتظامی امور کے لئے جس طرح ان کی خدمات ناگزیر تھیں ان کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے ماحول میں کوئی بھی سلطان علماء و مشائخ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کے سلطان سے قریب ہونے یا ان کے تفویض کردہ مناصب اور انعامات و وظائف کو قبول کرنے کا ہرگز یہ لازمی نتیجہ



نہیں ہوتا تھا کہ وہ جرأت و حق گوئی کے اوصاف کھو بیٹھتے تھے۔

زیر مطالعہ کتاب کے مباحث کا ایک بہت ہی قیمتی حصہ اس سوال کے جواب سے تعلق رکھتا ہے کہ سلاطین دہلی نے اپنی حکومت میں شریعت کو کس حد تک دخیل بنایا یا یہ کہ حکومت کے اصول و ضوابط میں شرعی قوانین کی کیا حصہ داری رہی ہے۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے جو براہ راست سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات سے منسلک ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جس قدر اہم ہے اسی قدر پیچیدہ و مشکل بھی ہے۔ اس راہ کی سب سے بڑی دشواری سلاطین کی دین داری و پابندی شریعت کے بارے میں مورخین کی مبالغہ آرائی و تضاد بیانی ہے۔ یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کسی ایک سلطان کے باب میں ایک ہی مورخ کے متضاد بیانات و تاثرات سامنے آتے ہیں۔ تاریخی کتب اور دوسرے نوع کے مآخذ (تذکرے، انشار و تصوف وغیرہ سے متعلق تصنیفات) میں تضاد کی مثالیں اپنی جگہ ہیں۔ فاضل مصنف کو زیر بحث موضوع کے مطالعہ کی دشواریوں کا بخوبی احساس تھا اور ان کی جانب انہوں نے اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود جو کچھ بھی اس سے متعلق انہیں مواد مل سکا ہے اسے انہوں نے زیر نظر کتاب میں نہایت قرینے سے مرتب کر دیا ہے اور ان کی روشنی میں اپنے نتائج بھی پیش کئے ہیں۔

یہ بحث دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک جانب شریعت سے سلاطین کے تعلق پر معاصر و غیر معاصر مورخین کے عام بیانات و تاثرات ہیں جو شریعت کے احترام و نفاذ میں ان کے احساسات و جذبات کو واضح کرتے ہیں اور فکری و نظریاتی طور پر شریعت سے ان کی وابستگی کو ثابت کرتے ہیں۔ دوسری جانب ان کے ذاتی احوال و کوائف، حکومت کے اصول و ضوابط اور انتظامی اقدامات کی تفصیلات ملتی ہیں جن سے شریعت کی مطابقت و مخالفت یا اسلامی اصول و ضوابط کی پیروی و پامالی دونوں طرح کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ گو اس طرح کی مثالیں تمام سلاطین کے یہاں یکساں طور[21]

نہیں ملتیں تاہم جو باتیں تمام سلاطین کے یہاں مشترک پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں :
(۱) سیاست وحکومت سے متعلق مختلف معاملات میں شریعت کا موقف جاننے کی خواہش وکوشش (۲) اپنے انتظامی ضوابط واقدامات کے لئے قانونی جواز کے حصول میں دلچسپی (۳) علماء ومشائخ کو حکومت کے کاموں پر شرعی نقطہ نظر سے اظہار رائے کی آزادی دینا اور ان کی تنقید کو گوارا کرنا (۴) محاصل کے شعبہ کو شریعت کے مطابق چلانے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ (۵) عدل وانصاف کے معاملات میں نفاذ شریعت پر خصوصی زور (۶) مخالفوں اور باغیوں سے نپٹنے یا سیاسی جرائم کی سزا کے باب میں شرعی اصول سے انحراف کی مثالوں کی زیادتی۔

حکومت وشریعت کے تعلق پر کتاب کے مباحث سے ان عام نکات کے اخذ ہونے کے ساتھ اس باب میں سب سے پیچیدہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے وہ سلاطین کے بارے میں مورخین کی تضاد بیانی ہے۔ اس کے علاوہ بعض سلاطین کے بارے میں صوفی لٹریچر سے جو تاثرات ابھرتے ہیں وہ تاریخی کتب کے مواد سے متصادم نظر آتے ہیں۔ اسے کچھ مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء) کے بارے میں ایک جانب بعض مورخین کا یہ بیان منقول ہے کہ وہ سلطنت وبادشاہت کے استحکام کے لئے ظاہری شان وشوکت اور رعب ودبدبہ کے اظہار کا قائل تھا اور انتظامی عہدوں پر تقرری اور دوسرے اہم امور کی انجام دہی کے لئے حسب ونسب کے امتیازات پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایرانی بادشاہوں کے خاندان (آل افراسیاب وغیرہ) سے اپنا تعلق جوڑنے میں فخر محسوس کرتا اور کم حیثیت یا کمتر نسل کے لوگوں سے اختلاط بھی پسند نہیں کرتا تھا[۲۱] دوسری جانب تاریخی ماخذ میں علماء ومشائخ سے سلطان کی عقیدت اور عام لوگوں کے ساتھ ان کی مجلس میں حاضری کا ذکر ملتا ہے اور اس کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ بادشاہی کے حقوق حضرت عمر بن خطابؓ و



حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نمونے پر ادا کرنے چاہئیں[۲۲] مزید براں سلطان کے بارے میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ ایک درویش کی خاطر تخت وتاج چھوڑنے اور سلطنت سے دست بردار ہونے پر بھی راضی ہوگیا تھا[۲۳]۔ ایک طرف سلطان سے متعلق مورخین یہ تاثر دیتے ہیں کہ مظلوموں کی دادگری اور عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرنے میں وہ بڑا سخت واقع ہوا تھا۔ یہاں تک کہ برتر وکمتر، طاقت ور وکمزور، اپنے پرائے کسی میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا تھا[۲۴] دوسری طرف اس کے بارے میں یہ بھی مذکور ہے کہ حریفوں ومخالفوں سے نبرد آمائی اور انہیں سزا دینے میں شریعت کے حدود سے تجاوز کر جاتا تھا اور وہ اللہ کے خوف سے بے پروا ہو کر باغیوں کی خوں ریزی کرتا، کسی کو تلوار سے قتل کرا دیتا، کسی کے ہاتھ پیر کٹوا دیتا، بعض کو اونچائی سے نیچے گروا دیتا اور بعض کو پانی میں ڈبا دیتا[۲۵] مزید براں یہ بھی معروف ہے کہ سلطان بلبن اپنے مربی سلطان ناصر الدین کو قتل کرانے کی وجہ سے "خواجہ کش" کہلایا اور اسی سبب سے سلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) نے کبھی اس کی قبر کا رخ نہ کیا جب کہ ہر مہم پر جانے سے قبل اپنے پیش رو سلاطین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا اس کا معمول تھا[۲۶] دوسری جانب بعض مورخین نے اس کے عہد حکومت کو "خیر الاعصار" سے تعبیر کیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اس کے زمانہ میں ظلم وستم کا نام ونشان باقی نہیں رہا اور عدل وانصاف کا بول بالا ہوا[۲۷] اسی طرح سلطان جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ - ۱۲۹۵ء) کے بارے میں پیش نظر کتاب میں ضیاء الدین برنی کا یہ بیان مذکور ہے کہ وہ روزہ ونماز کا پابند تھا، خدا ترسی اور حلم وکرم سے متصف تھا۔ اس کے عہد میں احکام شریعت کا پاس ولحاظ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اگر کوئی احکام شریعت کے خلاف کچھ کرتا نظر آتا تو وہ سزاوار لعنت وملامت اور ناقابل اعتبار سمجھا جاتا[۲۸] لیکن اسی مورخ کے حوالہ سے سلطان کے بارے میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ وہ عیش وطرب میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

اس کے دربار میں ساقی و مطرب کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ برنی نے اس کی مجالس نشاط کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے سلطان کے ان اوصاف کی یکسر نفی ہوتی ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا[۱۹]۔ عہد سلطنت کے معروف مورخین میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی، برنی و عصامی نے سلطان علاء الدین خلجی کی دینی اعتقاد میں پختگی، دین داری، دین پروری اور شریعت کے پاس و لحاظ کی کافی تعریف کی ہے اور اس کے بارے میں یہاں تک تاثر دیا ہے کہ اس کے عہد حکومت میں دین کی رونق بڑھی اور شریعت کو عزت و وقار نصیب ہوا[۲۰]۔ برنی نے احکام شریعت کے نفاذ میں سلطان کی دلچسپی اور منکرات (بالخصوص شراب نوشی، قحبہ گری، اصحاب اباحت کی بے راہ روی) کے خاتمہ اور عوام کی اخلاقی زندگی کی اصلاح کے لئے اس کی احتسابی کارروائیوں کی تفصیلات پیش کی ہیں[۲۱] لیکن اسی کے ساتھ مخالفوں، باغیوں اور سیاسی مجرموں کو سزا دینے کے باب میں سلطان کی بے اعتدالی، احکام شریعت کی پامالی کی مثالیں بھی تاریخی ماخذ کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہیں۔ برنی کے بیان کے مطابق مذکورہ لوگوں سے نپٹتے وقت سلطان یہ نہیں دیکھتا تھا کہ یہ عمل جائز ہے یا ناجائز، یہ طریقہ سزا شریعت سے ثابت ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ بعض اوقات وہ باغیوں و شورش پسندوں کو قتل کرانے کے ساتھ ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتروا دیتا تھا[۲۲]۔

سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے بارے میں متعدد مورخین کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کو علم دین کا گہرا علم تھا۔ قرآن کے حافظ تھے اور فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" انہیں زبانی یاد تھی۔ اسی کے ساتھ وہ نماز روزہ کے پابند تھے اور منکرات (منشیات، جوا و قمار وغیرہ) سے سخت اجتناب کرتے تھے[۲۳]۔ دوسری جانب معاصر مورخ عصامی نے سلطان کو دین کا بدخواہ، شریعت کی علانیہ خلاف ورزی کرنے والا اور مذہب اسلام کو نقصان پہونچانے والا بتایا ہے۔ اور یہ بھی رائے ظاہر کی ہے کہ ایسے سلطان کے خلاف بغاوت جائز ہے[۲۴]۔ صاحب کتاب نے



عصامی کے ان تاثرات کی تاویل کی ہے کہ اسے سلطان کے حکم پر اپنے دادا (جو تقریباً نوے برس کے تھے) کے ساتھ دلی سے دولت آباد سفر کے دوران کافی زحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسی لئے اسے سلطان سے سخت نفرت پیدا ہوگئی تھی جو بالآخر اس کی تنقید و تنقیص میں منتج ہوئی[۲۵]۔ لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ بعض دوسرے مورخین کے بیانات سے بھی سلطان کے رویہ میں تضاد کا ثبوت ملتا ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ کتاب سے سلاطین دہلی کی دین داری و پابندی شریعت کے بارے میں متضاد تصاویر سامنے آتی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تاریخی ماخذ ہی کے مواد سے تیار کی گئی ہیں۔ اگرچہ مصنف گرامی نے مختلف مقامات پر مورخین کے متضاد بیانات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض اوقات یہ تضاد اتنا واضح اور کھلا ہوا ملتا ہے کہ اس کی کوئی تاویل بن نہیں پڑتی یا تاویل کی جاتی ہے تو وہ کھینچا تانی نظر آتی ہے۔ اس صورت حال میں زیر بحث مسئلہ میں کسی قطعی نتیجے تک پہنچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں حکومت و شریعت کے تعلق یا شریعت کے تئیں سلاطین کے رویہ کی بابت مصنف نے اپنے فراہم کردہ مواد سے جگہ جگہ جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں شریعت سے حکومت کا تعلق ظاہری و رسمی تھا۔ بعض سلاطین نے شریعت کے نفاذ میں دلچسپی و سنجیدگی دکھائی اور اس راہ میں کچھ پیش قدمی بھی کی لیکن عملی دشواریوں کے سبب وہ یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے کہ آج کے دور میں حکومت کو شریعت کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا[۲۶]۔ گو اس طرح کے بیانات بعض مورخین کے حوالہ سے سلاطین سے منسوب کئے گئے ہیں لیکن قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ سلاطین نے اس طرح کے خیالات ظاہر کئے تھے۔ یا یہ خود مورخین ہی کی ذہنی اپج تھی اور انہوں نے سلاطین کی زبان سے اپنی فکر کی ترجمانی کی تھی۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ان سلاطین (بعض مستثنیات کے ساتھ) نے حکومت کو شریعت کے مطابق چلانے کی سنجیدہ

کوشش نہیں کی لیکن یہ کہنا کہ وہ اسے ناممکن سمجھتے تھے خلاف واقعہ ہوگا۔ اس لئے کہ ایک جانب وہ اپنے آپ کو بادشاہِ اسلام، خادم دین، محافظ شرع، حامی شریعت، محی سنن خاتم النبیین، ممہد بنیان رسوم مسلمانی اور مبانی مذہب نعمانی کہلوانے میں فخر محسوس کریں اور دوسری جانب یہ خیال ظاہر کریں کہ وہ امور مملکت شریعت کے مطابق انجام نہیں دے سکتے۔ ان دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ خود زیر مطالعہ کتاب میں سلاطین دہلی کے احترام شرع، انتظامی امور میں علماء سے مشورے اور نظم حکومت کے مختلف شعبوں میں شرعی ضوابط کے نفاذ کی بہت سی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ کہنا کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں حکومت کو شریعت کے مطابق چلانا ممکن نہ تھا یا یہ کہ سلاطین پر عوام کے مختلف طبقوں کے جذبات و مطالبات کا ایسا دباؤ تھا کہ ان سب کی رعایت کرتے ہوئے حکومت کے دائرے میں شرعی قوانین کا نفاذ بہت پیچیدہ مسئلہ تھا[32] کوئی معنی نہیں رکھتا۔ راقم کے خیال میں اگر کوئی مسلم حکمراں کسی بھی دور میں انتظامی معاملات میں نفاذ شریعت یا حکومت کو شریعت کے مطابق چلانے میں سنجیدہ اور مخلص ہو اور اسے واقعی اس کا احساس ہو کہ اسلامی شریعت ہی عام لوگوں کے لئے باعث راحت و رحمت ہے تو اسے اس کام میں کوئی مانع نہیں پیش آسکتا۔ بلکہ قرآن کریم کی اس آیت کے مطابق اسے اس کام میں نصرت الٰہی نصیب ہوگی۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد۔ ۷)

[اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا]

ظاہر ہے کہ اللہ کی مدد کرنے کا مطلب جملہ انسانوں کے لئے اس کے پسندیدہ و منتخب کردہ دین اسلام کو فروغ دینا اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت کو زندگی کے مختلف شعبوں میں جاری و ساری کرنا ہے۔



زیر بحث موضوع کے مطالعہ میں اصل دشواری یہ ہے کہ ہم عہد وسطیٰ کی مختلف بادشاہتوں (بشمول دہلی سلطنت و مغل بادشاہت) کو اسلام کے نظام حکمرانی یا خلافت راشدہ کے عملی نمونہ پر ناپنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب صورت حال مختلف پاتے ہیں تو اسلام و اسلامی شریعت سے ان کے تعلق کو ثابت کرنے کے لئے اس تضاد کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں اور اس کے لئے مصالح کی رعایت، حالات زمانہ کے تقاضے اور عملی دشواریوں یا پیچیدہ مسائل کا سہارا لیتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں (اور یقیناً رکھنا چاہئے) کہ اسلامی شریعت کے نفاذ میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی بھلائی و آسانی ہے تو مذکورہ تمام باتوں کی حیثیت عذر لنگ کے سوا اور کچھ نہ ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ سیدھے سادے انداز میں ہم یہ تسلیم کریں کہ دہلی سلطنت بادشاہی نظام پر قائم تھی۔ سلاطین دہلی یقیناً مسلمان تھے۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی شریعت سے تعلق کا برملا اظہار کیا۔ شریعت کا احترام اور اس کی پاسداری کا چرچا ان کے یہاں خوب ملتا ہے اور شریعت کے نفاذ میں دلچسپی بھی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ۲ تین ۳ کو چھوڑ کر باقی حکمرانوں نے نہ تو نفاذ شریعت پر بہت زیادہ توجہ دی اور نہ سنجیدگی و باقاعدگی کے ساتھ اس راہ میں عملی قدم اٹھائے۔ یہ اور بات ہے کہ نفاذ شریعت کی جزئی مثالیں تقریباً ہر سلطان کے دور میں ملتی ہیں اور جہاں تک مختلف سلاطین کے عہد میں نفاذ شریعت کی نوعیت اور اس کے حدود کا تعلق ہے اس کا زیادہ تر انحصار سلطان کے اپنے ذہنی رجحانات اور فکری میلانات پر تھا اور بلاشبہ انہیں سمجھنے میں یہ کتاب بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

مختصر یہ کہ پیش نظر کتاب میں سلاطین دہلی کے مذہبی افکار اور شریعت سے ان کی فکری و عملی وابستگی کے بارے میں جو کچھ مباحث ملتے ہیں اس پر مزید مطالعہ و تحقیق کی ابھی بہت کچھ گنجائش باقی ہے اور مصنف گرامی مرحوم نے اس اہم و نادر موضوع پر جو کچھ مواد اکٹھا کیا تھا نئے دریافت شدہ

ماخذ کی روشنی میں ان پر اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے لیکن زیر بحث موضوع پر اولین تالیف کی حیثیت سے "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے جس سے کسی صورت میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے تاریخ نگاری کی عام روایت سے ہٹ کر عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے اس نئے اور اچھوتے پہلو (دین و شریعت سے اہل حکومت کی وابستگی کی نوعیت اور ان کے مذہبی افکار کا ارتقاء) پر جس تفصیل و جامعیت سے روشنی ڈالی ہے وہ انہی کا حصہ تھا۔ جس وقت اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی کم از کم اردو میں اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب موجود نہ تھی۔ اس طرح عہد زیر بحث سے متعلق تاریخ نگاری کی ایک نئی روایت قائم کرکے پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک بنیاد فراہم کی جس سے یقینی طور پر اس عہد کی تاریخ کے طلبہ و اساتذہ کو ایک نیا انداز و رجحان ملا اور محققین و مورخین کو تاریخ نگاری کی ایک نئی سمت و جہت نصیب ہوئی اور یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زیر مطالعہ کتاب نے نہ معلوم کتنے لوگوں میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی مذہبی و ثقافتی تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور اس نظر انداز کئے جانے والے موضوع کے مطالعہ و تحقیق کے لئے ان کے شوق کو پروان چڑھایا۔ ایسے لوگوں میں یہ ناچیز راقم بھی شامل ہے۔ اللہ کرے اس عہد کی مذہبی و ثقافتی تاریخ میں اہل علم و اصحاب قلم کی دلچسپی بڑھتی رہے اور اس "بدنام" عہد کی تاریخ سے حقایق کے پردے اٹھ جائیں تاکہ اس کی مسخ شدہ تصویر صاف ہوجائے۔

---

## حواشی و مراجع

[1] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۱-۱۲ (دیباچہ)
[2] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۵ (تعارف) [3] ایضاً ص ۶-۷ (مقدمہ) [4] ایضاً ص ۷-۸
[5] ایضاً ص ۸ [6] ایضاً ص ۱۱-۲۷ [7] ایضاً ص ۲۳، ۴۲، ۱۱۲-۱۱۴، ۱۶۳-۱۶۸، ۲۱۲، ۲۱۲-۲۷۳،



۲۷۴، ۳۱۳-۳۱۴، ۳۷۰-۳۷۲، ۴۰۲-۴۰۳ [8] ایضاً ص ۵۴، ۱۰۵-۱۰۶، ۱۲۰، ۱۵۸، ۲۰۸-۲۰۹، ۲۳۲-۲۳۷، ۳۱۵-۳۱۶، ۴۱۶-۴۱۷، ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۲۸، ۴۵۲-۴۵۳۔ نیز دیکھئے راقم کی کتاب "اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں" (ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء) کا ابتدائیہ ص ۱۰-۲۲ [9] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۲-۴۸، ۱۳۱، ۱۵۰-۱۵۱ [10] ایضاً ص ۱۴۱ [11] ایضاً ص ۱۰۶، ۱۱۴ [12] ایضاً ص ۱۳۱-۱۳۲ [13] ایضاً ص ۲۲ [14] ایضاً ص ۱۳۱ [15] ایضاً ص ۲۳۱ [16] ایضاً ص ۲۲۶، ۲۲۹ [17] ایضاً ص ۲۳۲، ۲۳۹۔ بحوالہ برنی ص ۲۹۰-۲۹۶ [18] ایضاً ص ۲۳۹-۲۴۰، بحوالہ سید محمد کرمانی، سیرالاولیاء ص ۲۹۵، ۳۱۱ [19] ایضاً ص ۲۷۱، ۲۷۶، بحوالہ سیرالاولیاء ص ۳۱۲-۳۱۳، برنی ص ۲۳۲، نظام الدین احمد بخشی ص ۱۶۶-۱۶۷ [20] ایضاً ص ۲۶۷-۲۷۰، بحوالہ عصامی ص ۲۲۴، ۲۲۶، اخبار الاخیار ص ۱۲۷، ۱۷۳، ۱۷۵ [21] ایضاً بحوالہ برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵-۳۰، ۳۴، ۳۷، ۷۰، ۱۰۳۔ شیخ نور الحق، زبدۃ التواریخ، ورق ۱۶ ب [22] ایضاً ص ۱۵۸-۱۵۹، ۱۷۶، بحوالہ برنی ص ۳۶، ۴۴، ۷۴، ۱۰۲ [23] ایضاً ص ۱۶۷-۱۶۸ بحوالہ سیرالاولیاء ص ۱۱۲-۱۱۳ [24] ایضاً ص ۱۷۷-۱۷۸، بحوالہ برنی ص ۳۴۳، ۳۴۴ نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری ۱/۷۹ [25] ایضاً ص ۱۸۰-۱۸۱ بحوالہ برنی ص ۳۴۷-۳۴۸ نظام الدین احمد بخشی ۱/۸۲ [26] ایضاً ص ۱۵۲-۱۵۳ بحوالہ عصامی، فتوح السلاطین ص ۱۶۳، ابن بطوطہ، عجائب الاسفار (اردو ترجمہ)، ص ۷۵، شیخ نور الحق، ۱۶ الف-۱۵ ب [27] ایضاً ص ۱۵۵ بحوالہ برنی ص ۱۱۱، عصامی ص ۱۶۴ [28] ایضاً ص ۲۰۰-۲۰۱ بحوالہ برنی ص ۱۹۳، ۲۰۲-۲۰۵ [29] ایضاً ص ۲۱۳، ۲۱۳-۲۱۴، بحوالہ برنی ص ۱۱۹-۲۰۱ [30] ایضاً ص ۲۱۶-۲۱۷، ۲۴۳، ۲۵۹، ۲۶۳، بحوالہ برنی ص ۲۲۹، امیر خسرو، مطلع الانوار، ص ۱۴۳، مثنوی دولرانی خضر خاں ص ۴۶-۴۷، خزائن الفتوح ص ۲۷، دیوان امیر حسن سجزی، ۴۵۳، ۴۵۵، ۵۲۵، ۵۴۷، عصامی، فتوح السلاطین ص ۳۰۱، شیخ نور الحق،

زبدۃ التواریخ، ورق ۲۸ ب ۳۱ ایضاً ص ۲۴۳، ۲۵۰، بحوالہ برنی ص ۲۸۴، ۲۸۶، ۲۹۶۔
یحییٰ بن احمد سہرندی. تاریخ مبارک شاہی ص ۷۴۔۷۵، امیر خسرو، خزائن الفتوح ص ۱۹، ۲۱،
نظام الدین احمد بخشی ۱/ ۱۵۳، ۱۶۸ ۳۲ ایضاً ص ۲۵۸۔۲۵۹ بحوالہ برنی ص ۲۵۳۔۳۲۸۔
۳۳ ایضاً ص ۳۲۹، ۳۳۳، بحوالہ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ)
ص ۳۷، برنی ۴۰۰، ۴۹۵، ۵۰۶، ۵۲۲، نظام الدین احمد بخشی ۱/ ۱۰، عبد الباقی نہاوندی،
ماثر رحیمی ۱/ ۳۴۵، ۱۰ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، ص ۱۷۶ ۳۴ ایضاً ص ۳۲۶، ۳۳۷۔
۳۲۸، ۳۴۵، بحوالہ عصامی، فتوح السلاطین ص ۴۵۱، ۵۱۵، ۶۰۶ ۳۵ ایضاً ص ۳۲۶
۳۶ ایضاً ص ۳۲، ۴۳۸، ۲۳۹، ۲۸۰۔۲۸۱ ۳۷ ایضاً ص ۱۹، ۲۱، ۴۲۔

---

## تاریخ اسلامی ہند پر دار المصنفین کی چند اہم مطبوعات

از سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم

۱۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک ۸۰ روپے

۲۔ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر ۳۵ روپے

۳۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے ۵۰ روپے

۴۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول ۵۰ دوم ۳۰ روپے

۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری اول ۳۰ دوم ۳۸ سوم ۵۶ روپے

۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے

قیمت ۸۰ روپے

"مینجر"



# مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی نثر نگاری کی ایک جھلک

## ایک مجموعۂ مکاتیب کے آئینے میں

از جناب سبط محمد نقوی ٭

ان سطروں کے کم سواد راقم کے لئے اچنبھے کی بات ہے کہ اب علمائے دین کی اردو دانی کو غیر معتبر گرداننے کا رجحان پنپ رہا ہے۔ لفظ کی تذکیر و تانیث کی گفتگو میں ایک عقیل اور فریس یونیورسٹی پروفیسر نے مخاطب سے فرمایا "خدارا مولوی صاحبان کی زبان کا حوالہ نہ دیجیے گا"۔

ابھی حال میں ایک دوسرے پروفیسر صاحب کو مولانا کے اردو نثر نگار ہونے میں تردد ہوا موصوف کی رائے میں مولانا علی میاں صاحب عربی کے اہل قلم ہیں اور اردو نثر نگار کی حیثیت سے ان کا قلم اہم نہیں۔ اس کی وجہ ایک حد تک سمجھ میں آتی ہے۔ مولانا کے مصنفات بہت بڑی تعداد میں اردو کے کتب خانے کی زینت ہیں لیکن ان میں فی الاصل مولانا کی اردو تحریریں کون کون سی ہیں اور عربی سے ترجمے کون کون سے ہیں ان کا شمار کرنا پڑے گا۔ حضرت مولانا کے افادات کا خاصہ حصہ نظر قاصر سے گزرا ہے بعض مضامین میں اردو مترجم کا نام بھی نظر نواز ہوا لیکن اصل اردو تحریروں کی شناخت اتنی پر صعوبت مہم نہیں ہے کہ جس سے خوف زدہ ہو کے مولانا کے اردو ادیب ہونے سے انکار کر دیا جائے۔

منشی پریم چند نے بھی سب ایک ہی زبان میں نہیں لکھا ہے۔ ناول، کہانیاں اصلاً اردو ہی میں

---

٭ اڈیٹر ہفت روزہ توحید میل، امام باڑہ غفران مآب۔ لکھنؤ۔

زیادہ تعداد میں لکھیں۔ صحافی کی حیثیت سے تقریباً ان کے قلم کا سارا سرمایہ ہندی میں ہے۔ منشی دیا نرائن نگم کی خاطر سے 'زمانہ' یا دوسری جگہوں میں جو کچھ لکھا اس میں منشی جی کی حیثیت مضمون نگار کی ہے 'صحیفہ نگار' کی نہیں۔ صحافی کی حیثیت ان کی 'ہنس' میں مسلم ہوئی۔ لیکن انہیں اردو ہندی دونوں زبانیں اپنی بزم کا چراغ فروزاں سمجھتی ہیں۔ ہاں! یہ امتیاز تسلیم کیا جانا چاہئے کہ منشی جی نے اپنی اردو کو ہندی یا ہندی کو اردو بقلم خود کیا۔ حضرت مولانا نے عربی کی تحریروں کے ترجمے اپنے شاگردوں اور متوسلوں کے ذمے کئے۔ مجھے کوئی قطعی اطلاع نہیں ہے۔ مگر قیاس یہی ہے کہ ان ترجموں پر نظر فرمائی ہوگی اور اس کی نوک پلک درست کی ہوگی۔ لہذا راقم حضرت مولانا علی میاں صاحب کو نامدار اور نمودار اردو کا ادیب و نثار سمجھتا ہے۔

یہاں اس کی یاددہانی بے محل نہ ہوگی کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں کون کون سے عناصر کارفرما رہے ہیں؟ ان کا ایک مختصر جائزہ اس طالب علمانہ مطالعے کے لئے مفید ہوگا لیکن راقم اس مطالعے سے قبل ایک سوال اٹھانے کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو دانش مند 'مولویوں' کی زبان سے کسی لسانی مسئلہ پر استدلال درست نہیں سمجھتے ہیں۔ کیا ان کی رائے میں مذاہب نے زبان کے تشکیلی عمل میں موثر کردار نہیں ادا کیا ہے؟ سنسکرت کو آج جو تقدس ملا ہے اس میں کیا ہندومت کا ہاتھ نہیں؟ کیا ہندوستانی بولیوں کے عروج و فروغ میں گوتم بدھ کی فکر کا ہاتھ نہیں۔ کیا اس کے بنا پر اکرتیں برگ و بار لا سکتی تھیں۔ ہم یہ عرض نہیں کر رہے ہیں کہ محض مذہب زبان کا واحد و تنہا تشکیلی عنصر ہے۔ لاریب کہ زبان کی تشکیل و ترقی میں تہذیبی و ثقافتی اثرات کی کارفرمائی کم نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ مذہب کے مقابلے میں کچھ بیش ہو لیکن آج زبان کی نمائندگی کے حق سے مذہبی شخصیتوں کا محروم کر دیا جانا کسی طور پر معقول بات نہیں نہ اس خطا پر ان کو اردو کی بزم سے بدر کر دیا جانا درست قرار پا سکتا ہے کہ وہ اردو میں کم اور کسی دوسری زبان میں زیادہ



لکھتے ہیں۔ اس بارے میں آپ پروفیسر احتشام حسین کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اردو ادب کی مروج تاریخوں میں اردو نثر کی ابتدا بھی محمد شاہی عہد (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) سے ہی مانی جاتی ہے اور سب سے پہلی کتاب فضلیؔ کی کربل کتھا قرار دی گئی ہے۔ فضلیؔ کا نام فضل علی تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب ۱۷۳۱ء میں مرتب کی پھر خود ہی ۱۷۴۸ء میں اس میں ترمیم کی۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی کتاب "روضۃ الشہدا" محرم کی مجلسوں میں بہت پڑھی جاتی تھی۔ مگر فارسی میں ہونے کے باعث بہت سے لوگوں خاص کر عورتوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لئے فضلی نے اسے اردو میں منتقل کر لیا۔ اس میں کربلا کے پُردرد المیے اور امام حسینؑ کی شہادت کا بیان تاریخی اور مذہبی اعتبار سے کیا گیا ہے۔ فضلی اس وقت تک اردو کی کسی نثری تصنیف سے آگاہ نہیں تھے۔ وہ اپنی تالیف کو پہلی تخلیق سمجھتے ہیں۔ کئی علماء نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ فضلی بھی جنوبی ہند کے رہنے والے تھے۔ کیونکہ ایک آدھ محاورے ان کے یہاں بھی وہی ملتے ہیں جو دکنی اردو میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اسے کوئی قطعیت بخش ثبوت نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا اسلوب دکنی اہل قلم کے اسلوب سے مختلف ہے۔ اگر وہ دکن کے باشندے ہوتے تو انہیں وہاں کی تصنیفوں و ترجموں کا علم ضرور ہوتا۔ فضلی کی زبان میں فارسی عربی کے لفظ بہت آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک مذہبی کتاب میں ان الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ جن کو اس کے قاری جانتے رہے ہوں گے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ شمالی ہند میں جو اردو پھیل رہی تھی وہ دلی سے قریب ہونے اور فارسی زبان و ادب سے متاثر ہونے کے باعث آسانی سے فارسی عربی الفاظ کو قبول کر لیتی تھی۔ کیونکہ سکندر لودی اور ٹوڈرمل کے حکم کے بموجب سرکاری اہل کاروں کا فارسی

جاننا ضروری تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر بول چال کی زبان پر بھی پڑا ہوگا" کربل
کتھا" جرمنی کے ایک کتب خانے میں مل گئی اور اب بہت محققانہ حواشی کے ساتھ اسے
شائع بھی کر دیا گیا ہے۔"[لہ]

اس اقتباس کو محض عطر سخن سمجھیں، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "اردو کی نشو و نما میں
صوفیائے کرام کا حصہ" کے نام سے پوری کتاب ہی لکھ دی ہے۔ اس کی مراد و معنویت بھی کچھ کم
اہمیت و عظمت نہیں رکھتی ہے۔ کیا یہ کہہ کے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب اردو کے ادیب نہ تھے
ہم ان خیالات کی ناقدری نہیں کرتے جو مولانائے مرحوم نے ملک و ملت کے تعلق سے ظاہر کئے
ہیں۔ ہر وہ بالغ نظر جس کا اس ملک کی تاریخ خصوصاً تقسیم وطن کے بعد کی سرگزشت سے
ربط و رشتہ ہے، وہ جانتا ہے کہ تعمیری خیالات کا اتنا عظیم گنجینہ اور صورت حالات کا ایسا روشن
آئینہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ تو بڑی بوالعجبی ہوگی کہ سیاست کی راہ سے جو خیالات آئیں انہیں قابل
توجہ گردانا جائے لیکن اگر وہ رشد و ہدایت کی راہ سے آئیں تو اس لئے ناقابل اعتنا قرار دے
دئے جائیں کہ وہ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اردو کا نہیں عربی کا عالم و ادیب ہے۔ اردو
کو اگر سیکولر، جاندار، عوامی اور تعمیری مزاج کی زبان کی حیثیت سے زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے
تو اسے یہ دیکھنا ہی پڑے گا کہ اس کے دامن میں کیا کیا ہے اور تعمیری و مثبت استعمال کیسے
ہو سکتا ہے۔ یہ جائزہ قطعاً غیر ضروری ہے کہ یہ لعل و گہر زبان کے دامن میں کس نے ڈالے ہیں؟
یہ چیز نہایت قابل لحاظ ہے کہ ہمارے دیدہ ور اہل نظر نے اردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر ایسے
عنوان پر لکھ کر اردو کی جہاں گیری کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ اس وقت حسن اتفاق سے
"نیا دور لکھنؤ" کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع پروفیسر محمد انصار اللہ کا مضمون پیش نظر ہے یہ
فاضلانہ تحریر اردو کی جامعیت، بے تعصبی اور فراخدلی کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ اس



موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک نہایت لطیف فقرہ یاد آتا ہے۔ بات اس زمانے کی ہے
جب پنجابی صوبہ اور ہندی صوبہ کی لڑائی زوروں پر تھی اور یہ آخر میں پنجاب کی دوسری تقسیم اور
ہریانہ کی تاسیس پر منتج ہوئی، تب پنڈت جی نے کہا تھا "پنجاب والے لڑ تو رہے ہیں پنجابی اور
ہندی کے لئے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارا جھگڑا اردو میں چکایا جا رہا ہے"۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ
اس وقت اردو ہی کی پنجاب پر حکمرانی تھی۔ ہماچل پردیش کی بابت نہیں عرض کر سکتا مگر پنجاب
اور ہریانہ میں آج بھی اردو کا ماحول اتر پردیش سے بہتر ہے اور پنجاب اور ہریانہ ہی کیا جہاں
جہاں اردو والے ہیں ان ریاستوں میں اردو کی حالت یوپی کے مقابلے کہیں بہتر ہے۔ کیا اس
صورت حال کی صرف تنہا اور اکلوتی اکیلی ذمہ دار حکومت ہی ہے؟ اس نکتہ پر یہاں اظہار خیال
نہیں کرنا ہے اسے اہل فکر و نظر کی بس پیشکش کرنا ہے۔

اس طویل مگر ضروری تمہید کے بعد اب مولانا کے مکاتیب کی طرف ہمیں متوجہ ہونا چاہئے۔
فی الوقت ہمارے لئے جناب مولانا کی اردو نثر نگاری کا سیر حاصل تو کیا کار آمد مطالعہ بھی
ممکن نہیں۔ یہ جز وقتی اہل قلم کے بس کی بات بھی نہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ لکھنؤ یونیورسٹی کا
شعبۂ اردو یہ موضوع اپنے کسی ریسرچ اسکالر کو تفویض کرے گا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہ کام
لکھنؤ یونیورسٹی میں ہو۔ مولانا جہاں کے سابق طالب علم ہیں۔ لیکن اگر لکھنؤ اور کسی دوسری یونیورسٹی
کو یہ توفیق نہیں ہو سکی تو ندوہ کا شعبہ تحقیقات و نشریات یا دار المصنفین اعظم گڑھ اپنے سابق صدر
کا حق ادا کرے گا۔ ہم تو بس اس ناچیز معروضے میں مولانا کے مجموعۂ مکاتیب اردو پر نظر ڈالیں گے۔
مکتوب نگاری کا ادب سے جو رشتہ ہے اس پر دیر تک گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم بس یہ عرض
کرنے پر بس کریں گے کہ غالب اپنے اردو مکاتیب کی ہی بنا پر اردو کے عظیم نثاروں میں شمار
ہوتے ہیں۔ اب آئیے مولانا کے مکاتیب کی سیر کریں۔

پیش نظر مجموعۂ مکاتیب کا نام اتنا مطول ہے کہ جلی قلم سے سرورق کے پورے ایک صفحہ پر محیط ہے۔ میں مختصراً "علی میاں کے خطوط" کے مختصر نام سے اس کا تعارف کرا رہا ہوں۔ امید تو یہ ہے کہ ہمارے محترم قارئین کرام کی بہت بڑی تعداد کی نظر سے یہ مجموعہ گزر چکا ہوگا۔ جن حضرات کو اب تک یہ موقع نہ ملا ہو وہ فرید بک ڈپو ۴۲۲۔ مٹیا محل، جامع مسجد۔ دہلی ۶ سے اسے حاصل فرماسکتے ہیں۔ کتاب کی نسبت کچھ عرض کرنے کی بجائے کتاب کے عالم و معلم مقدمہ نگار مولانائے مرحوم کے تلمیذ ارشد، معتمد رفیق کار ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی کے اقتباس پیش کر رہا ہوں اس تحریر کی مناسبت سے ہم موخر اقتباس قبل اور مقدم اقتباس بعد میں پیش کر رہے ہیں۔

براہ کرم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ مقدمہ مولانا کے حین حیات ضبط تحریر میں آیا تھا اس لئے اس میں دعائیے اور تعظیمیے اس کے مطابق حال ہیں۔ اب آپ مکاتیب کے جمع و تدوین کے حوالے سے عالم مقدمہ نگار کا یہ اظہار خیال ملاحظہ کریں۔

"مکاتیب کے جمع کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ذوق مسلمانوں میں ہمیشہ رہا ہے، مکتوبات امام ربانی، مکتوبات حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری۔ مشاہیر علماء میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کے مجموعے نیز دیگر مشائخ کے مکتوبات اپنے حلقوں میں علمی، دینی، ادبی سرمایہ کا حکم رکھتے ہیں، احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کے مکاتیب قیصر و کسریٰ کے نام محفوظ ہیں اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ خود قرآن کریم میں بھی ایک مکتوب ہے۔ یہ اشارہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط کی طرف ہے جو آپ نے ملکۂ سبا بلقیس کے نام لکھا تھا۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل آیت ۳۱۔۳۰)[2]

مقدمہ نگار محترم نے اپنی تحریر کا بڑا حصہ مکتوب الیہ مولانا عبدالکریم پارکھ صاحب کے



ستائشی تعارف میں صرف فرمایا ہے۔ وہ تمام و کمال یہاں آپ کے ملاحظے میں پیش کیا جانا تو دشوار ہے مگر فصل کے ساتھ اس کا ایک قابل لحاظ جز نقل کیا جا رہا ہے۔

"داعی الی اللہ، مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ ان خوش قسمت اور بلند اقبال افراد امت میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی مشیئت و قدرت نے بہت متنوع اور گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا اور عزم و توفیق سے بہرہ مند فرمایا۔ اس عاجز کی نظر میں ان کی سب سے بڑی دولت قرآن کریم سے شغف اور اس کی خدمت اور اشاعت کا بے پناہ جذبہ ہے، ان کا تفسیری و بیانی ترجمۂ قرآن ان کی عقیدت و محبت کا ترجمان ہے، اس کے علاوہ جو بھی لکھا اور لکھتے ہیں اس کا تعلق قرآن کریم ہی سے ہے۔ "تفسیری خزانہ" بھی طالبان امن کے لئے آپ کا تحفہ ہے۔۔۔ مولانا پاریکھ کی تقریروں میں جاذبیت اور کشش ہوتی ہے اور قرآن کریم سے بہت برمحل استدلال کرتے ہیں۔ میں نے ان کی تفسیر قرآن پر تقریظ لکھتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے باقاعدہ قرآن حفظ نہیں کیا ہے لیکن ان سے اچھے حافظ کم دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ نتیجہ ہے ان کے وسیع مطالعہ اور قرآن سے شغف کا۔۔۔۔ مولانا "مجلس تعلیم القرآن ناگ پور" کے بانی و سرپرست ہیں۔ یہ ادارہ قرآن کریم سے متعلق علوم کی اشاعت میں سرگرم اور فعال ہے، اس کے علاوہ آپ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی اور مجلس نظامت کے رکن ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں میں ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی رہے ہیں، مجلس تحقیقات و نشریات کے رکن رکین ہیں"[3]

اب آپ مولانا کے خطوط کے اقتباسات دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ مفہوم و مراد کے علمی ہونے کے باوجود انداز بیان کتنا سادہ اور زبان کتنی آسان ہے۔ مولانا کی عبارت صحافتی عبارتوں سے بھی زیادہ سہل ہے۔ پھر یہ کہ کھری، خشک اور بے مزہ نہیں۔ نمونے ملاحظہ فرمائیں:

"... آپ نے قلب کی مشغولیت کا جو ذکر کیا ہے وہ بڑی دولت ہے اس کی حفاظت کیجیے۔

حاسدوں اور مخالفوں کے لئے دعائے خیر کی عادت ڈالیے اور اسی کو کام کی رسید سمجھئے..." ۱۲۶

اگر آپ قلب کی مشغولیت نہیں سمجھے تو یہ بیان کی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ اہل طریقت کی اصطلاح ہے لیکن حاسدوں اور مخالفوں کے لئے دعائے خیر کی تلقین تو سمجھ میں آگئی ہوگی۔ کیا آپ اس سے برتر تلقین کی توقع فرماسکتے ہیں۔ کام کی رسید سے بہتر اور کیا پیرایۂ بیان ہوسکتا ہے۔

بعض مسالک کے بارے میں جو عام خیال ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے مولانا کے یہاں اجتہادی رویہ پایا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو بین بین کی راہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

"... آپ کا خواب رویائے صادقہ معلوم ہوتا ہے اور حسب حال ہے۔ بہت سے لوگوں کا جو عملیات میں دخل رکھتے ہیں خیال ہے کہ مجھ پر عمل سفلی کیا گیا ہے۔ میں بھی اس کے اثرات محسوس کرتا ہوں، خاص طور پر سونے کی حالت میں، خواب میں آپ کو اسی کا علاج بتایا گیا ہے میں انشاء اللہ حدیث کے یہ الفاظ بھی پڑھوں گا۔ دوسرا خواب بھی مبارک ہے اور میرے لئے مبشرات میں۔" ص۳۵

مشہور یہ ہے کہ ایصال ثواب یا فاتحہ خوانی کے لئے حضرت مولانا کے کنبے میں "تداعی" نہیں ہوتی یعنی بلاوا نہیں دیا جاتا۔ یہ صحیح ہوسکتا ہے لیکن مولانا اس بارے میں بھی نرم رویہ اختیار فرماتے تھے مولانا پاریکھ صاحب کے عبدالرشید صاحب نامی رفیق کے انتقال پر تعزیتی مکتوب میں فرماتے ہیں:

"میں تو انشاء اللہ ان کے لئے دعا و ایصال ثواب کروں گا ہی۔ یہاں شعبۂ حفظ میں آپ کا خط بھجوا رہا ہوں تاکہ ان کے لئے اہتمام سے ایصال ثواب کیا جائے۔ امید ہے کہ خاصی تعداد میں قرآن شریف ختم کئے جائیں گے...." ص۱۱۱

فقہی موشگافی جو بھی ہو لیکن ایک عامی کو تداعی اور اہتمام میں کچھ ایسا فرق نہیں محسوس ہوتا



اور یہی ایک موقع نہیں دوسرا مورد بھی ہے۔

مولانائے مرحوم اور پاریکھ صاحب کی مراسلت میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے اس وقت کے سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس کا ذکر بہت آیا ہے۔ ناگ پور میں قیام کی وجہ سے دونوں میں اچھا ارتباط معلوم ہوتا ہے۔ بعض مواقع آپ بھی ملاحظہ کریں۔

"... گیتا مندر کے جلسہ کی رپورٹ سے بڑی مسرت ہوئی۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ کلام اللہ کی برکت سے آپ جس جلسہ یا اجتماع میں خطاب کریں گے آپ ہی بلند و بالا رہیں گے اور قلوب کی تسخیر ہوگی۔ آر، ایس، ایس کے چیف سے ملنا ہر حال میں اچھا ہے۔ آپ اس سے نہ گھبرائیں... باقی ملاقات پر جس کی توقع آپ نے دلائی ہے۔ اپنی شرکت پر غور کروں گا...." ص۴۵

جمشید پور کے قیامت خیز بلوے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"... جمشید پور کے واقعہ نے دل کو زخمی کردیا ہے شاید آپ کو اس کی سنگینی کا حال معلوم ہوا ہو، یہ معلوم کرکے تعجب بھی ہوا اور کوفت بھی کہ بالا صاحب دیورس اس حادثے سے چند دن پہلے وہاں موجود تھے، میں نہیں کہہ سکتا کہ حادثہ اور ان کے دورہ اور تقریروں میں کوئی ربط اور رشتہ تھا یا نہیں اس لئے کہ بغیر تحقیق کوئی بات نہیں کہنی چاہئے مگر لوگوں کے لئے دونوں میں جوڑ پیدا کرلینا بہت آسان ہے اور اس کے قرائن بھی موجود ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی صاحب ضمیر اور ذی شعور انسان اس طرح کے واقعات کو پسند کرسکتا ہے اور اس کا دل اس پر خون کے آنسو نہیں روئے گا، آپ سے ان کے حالات اور خیالات کا جو علم ہوا اس سے میں توقع کرتا تھا کہ ان جیسا کوئی لکھا پڑھا اور شریف انسان جہاں جائے گا وہاں اگر فساد ہونے والا بھی ہوگا تو اس کا خطرہ جاتا رہے گا۔

دنیا کی کوئی حکومت یا کوئی تہذیب اس ظلم و بربریت کے بعد پنپ نہیں سکتی اور

رب العالمین جو ارحم الراحمین بھی ہے کبھی اس کو مہلت نہیں دے سکتا، یہ وہ نکتہ ہے جس پر دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاقی فلسفہ متفق ہیں، آپ اپنے طور پر ان سے ملئے اور ان کے ضمیر کو ٹٹولیے کہ ان کو خود بھی اس واقعہ پر افسوس اور نفرت ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان سے بھی اور پوری ہند و تہذیب اور فلسفہ اور انسانیت کے مستقبل سے بھی مایوسی ہے، میں نے سیوان کی تقریر کا ہندی ترجمہ جس کا عنوان ہے "جب پڑھے لکھے انسان پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے" اس کے نسخوں کی ایک تعداد آپ کے نام بھجوائی، اگر آپ کسی بہانے سے یہ تقریر ان کو پوری سنا سکیں یا وہ آپ کے سامنے پڑھ لیں تو اس کی ضرور کوشش کیجیے۔ تجربہ یہ ہے کہ بعد میں کوئی پڑھتا وڑھتا نہیں، وعدہ کر لیتے ہیں پھر فرصت نہیں ملتی ..." ص ۵۲-۵۱

ایک اور خط میں لرزہ خیز واقعات کا ذکر فرماتے ہیں لیکن اس کی ذمہ داری آر، ایس، ایس پر ہے یا نہیں اس کا کوئی سراغ موجود نہیں ہے بہرکیف آپ متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"... مولانا منت اللہ صاحب کے جو خطوط آئے ہیں ان میں ایسے لرزہ خیز واقعات اور حقائق درج ہیں جن کو پڑھنا مشکل ہے، آپ اس سلسلے میں جو تمہیدی کوشش کر سکیں وہ ضرور کریں۔ کہیں ایک جگہ ملاقات کا انتظام ہو اور اس میں کچھ اعلیٰ سطح کے لوگ اور بھی ہوں، یہ کام جلد کرنے کا ہے اور اس کے سوا اور کوئی صورت ملک و ملت دونوں کی حفاظت کی نہیں ... فرقہ پرست اور جارحانہ مقاصد والی تنظیموں کے قائدین سے بھی ربط رہنا چاہیے ..." ص ۲۳۵

یہ خیال نہ ہو کہ حضرت مولانا کی تمام تر فکر مندی ہندی مسلمانوں اور ہندوستان تک ہی محدود تھی۔ پوری دنیا پر نظر رکھتے تھے اور عالم انسانیت کے لیے ان کا دل دھڑکتا تھا:

"... ایران و عراق کی جنگ اور پاکستان کے نسلی فسادات نے آنکھیں اتنی نیچی کر دی ہیں کہ



پریم و بھائی چارہ کی بات برادران وطن سے کہنے میں پچھلا اعتماد و جوش مشکل ہے ..." ص ۸۷

ملک و ملت دونوں کے تحفظ کی فکر مندی کا ایک ہلکا خاکہ یہاں پیش کیا گیا۔ آپ کی سیرت کے سبھی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے میں طوالت ہے۔ بس ایک پورا خط ملاحظہ فرما لیں اور میں زحمت تمام کر دوں:

"... لکھنؤ

محب گرامی منزلت داعی الی اللہ و خادم قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ۳ر نومبر کا لکھا ہوا مفصل مکتوب اس وقت سامنے ہے۔ ہندی اخبارات کے تراشے بھی پہنچے، ہم ہندی بالکل نہیں پڑھ سکتے۔ ہم "مجلس" کو بھیج رہے ہیں کہ ان کا ترجمہ کر کے یا خلاصہ لکھ کر دے دیں۔

آپ کے کئی بار ٹیلیفون بھی آئے۔ اتفاق سے ہم موجود نہیں تھے، رائے بریلی یا قریب کے ایک گاؤں میں تھے۔ کل ہی آئے۔ آپ سے جو ذہنی، فکری اور دینی مناسبت ہے، وہ شاید احباب، اہل تعلق میں سے اتنی کسی سے نہیں ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جو تاثرات لکھے ہیں تقریباً وہی تاثرات میرے بھی ہیں۔ دہلی کے اجتماع کا تجربہ بھی کچھ ایسا ہی رہا۔ علماء سے بھی ایسی ہی مایوسی ہوئی۔

یہاں مولوی کلب صادق صاحب رائے بریلی آئے اور دو مرتبہ لکھنؤ میں ملے۔ حالات اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی پر ہمارا نام آنے کی وجہ سے ہم کو لوگوں نے نشانہ بنا لیا ہے اگر حقائق اور خطرات سامنے نہ ہوتے تو ہم اپنی تصنیف و مطالعہ اور دعوت کے گوشے سے قدم بھی باہر نہ نکالتے، مسلمانوں کا مزاج وہی ہے جو آپ سمجھے ہیں اور اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔

یونس سلیم صاحب دہلی میں اسپتال میں داخل ہیں۔ آپ کے لئے اور اہل وعیال کے لئے برابر بلاناغہ دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے صلح و اعتدال کی راہ نکالے اور مسلمان دوسروں کو دعوت دے سکنے کے قابل ہوں۔

اس وقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ باقی عند الملاقات۔ نثار اور عبدالرزاق کا سلام قبول ہو۔

والسلام دعاگو و طالب دعا

۷/ نومبر ۱۹۹۰ء (مولانا) ابوالحسن علی ندوی[۳]

ختم کلام پر یہ گزارش لابدی ہے کہ جو زبان و انداز بیان ان مکاتیب میں ہے، مولانا کی کتابوں میں اس سے بہت مختلف ہے۔ کتابوں کی نثر بہت جاندار، چاشنی دار و دل آویز ہے۔ مولانا ابوالکلام صاحب کی نثر کی طرح مغلقات لغات سے بوجھل بھی نہیں لیکن مولانا کی نثر کا مطالعہ حریف مئے مردافگن عشق چاہتا ہے۔ دیکھیں اسے قدرت کاملہ کب سامنے لاتی ہے۔ ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ مولانا کا کوئی خط دوسرا ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ اس لئے نہیں عرض کر سکتے کہ یہ زبان و انداز بیان ان محترم مکتوب الیہ سے خاص تھا۔ یا یہ مکاتیب کی عمومی زبان ہے۔

---

## حاشیے

[۱] اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ پروفیسر سید احتشام حسین۔ قومی کونسل برائے فروغ زبان نئی دہلی ص ۸۰۔۷۹۔
[۲] علی میاں صاحب کے خطوط۔ مولانا عبدالکریم پارکھ کے نام۔ فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، ۴۲۲ مٹیا محل اردو مارکیٹ جامع مسجد دہلی ۶...۱۱ ص II-۱×× [۳] ایضاً۔



## تلخیص و تبصرہ

# جنوبی کوریا

از کلیم صفات اصلاحی

جنوبی کوریا براعظم ایشیا کے مشرق میں واقع ایک جزیرہ ہے۔ اس کے مغرب میں بحر اصفر ہے، جو اس کے اور چین کے درمیان حد فاصل ہے، کوریا کے مشرق میں جاپان، شمال مغرب میں سوویت یونین اور چین ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کوریا کے دو حصے کر دئے گئے۔ جنوبی کوریا مغرب کے اور شمالی کوریا سوویت یونین کے زیر اثر ہے۔

جنوبی کوریا دراصل پہاڑیوں کے سلسلے پر مشتمل ہے۔ یہ سلسلہ شمال سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے سواحل میں متعدد خلیج ہیں جن سے وہاں کی طبعی آب و ہوا خوشگوار رہتی ہے۔ جنوبی کوریا کے آس پاس تقریباً ۳ ہزار چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جزیرہ شیگو ہے۔ نکلنونج اور نہر ہان یہاں کی مشہور نہریں ہیں۔

جنوبی کوریا کا کل رقبہ ۹۸ ہزار مربع کیلومیٹر ہے اور ۳ کروڑ ۸۵ لاکھ اس کی آبادی ہے۔ اس کا دار السلطنت سیئول ہے۔ اس کے باشندوں کی اکثریت بدھ مذہب کی پیرو ہے۔ کچھ عیسائی ہیں اور مسلمان ۲۰ ہزار کے قریب ہیں۔

کوریا کی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے۔ اس لئے اس پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ لوگوں کو جانور پالنے اور ماہی گیری سے بھی دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد قسم کے کارخانے اور انڈسٹریز بھی ہیں۔

**اسلام کی آمد** عرب اس سرزمین سے بہت پہلے سے واقف تھے۔ مشہور جغرافیہ نویس ابن خرداذابہ نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں نویں صدی عیسوی میں عرب تاجروں کے شہر سیلا میں پہنچنے کا ذکر کیا ہے اور کوریا کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں عربوں سے اس کے تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ ۱۰۳۰ء میں عرب تاجروں کا ایک قافلہ کوریا پہنچا اور اس نے اس کے حکمراں جوان جونج کو ہدیے اور تحفے نذر کئے۔ عرب چین کے راستہ سے وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے وہاں قابل ذکر نقوش نہیں چھوڑے۔

اسلام کے پہنچنے کی ابتدا کوریا کی آخری جنگ ۱۹۵۰ء کے بعد ہوئی۔ شیخ عبدالرحمن کی سربراہی میں کچھ ترک نژاد باشندے جنوبی کوریا میں داخل ہوئے اور ۱۳۷۶ھ میں ایک مسجد تعمیر کی۔ جب یہاں مسلمانوں کی تعداد بڑھی تو ۱۹۶۳ء میں اسلامی کوریائی اتحاد کی بنیاد رکھی گئی۔ مالیشیا نے جنوبی کوریا کے مسلمانوں کی صحیح صورت حال سے واقف ہونے کے لئے حاجی نوح کمندوب کو روانہ کیا۔ ۱۳۸۶ھ میں دوبارہ پھر جب اتحاد الاسلامی الکوری کی تشکیل عمل میں آئی تو صبری سوج کو اس کا صدر اور عبدالعزیز کیم کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ دار الحکومت میں ایک مسجد بھی بنائی گئی۔ ۱۹۶۷ء میں صبری سوج نے اپنے استاد کیم کے جو جامعہ بانکوک میں عربی زبان کے استاد تھے ساتھ متعدد اسلامی ممالک کے دورے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اسی ضمن میں سعودی عرب، پاکستان اور مصر کا دورہ کیا۔ تاکہ کوریا کے مسلمانوں کے تعلقات عالم اسلامی سے استوار ہوں۔

**کوریا میں مسلمانوں کی آبادی** کوریا کے بیس ہزار سے زاید مسلمان تین علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۱۳۵۰ مسلمان تو راجدھانی سیئول میں ہیں۔ شہر بوسان میں ۸۵۰٪ کوانجو میں ۳۵۰٪ مقیم ہیں۔ خاص کوریائی مسلم باشندوں کے علاوہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے ۳۵۰۰ مسلمان بھی سکونت پذیر ہیں جن میں ۵۵۰٪ مسلمانوں کا تعلق سعودی عربیہ سے ہے۔ کوریا میں مسلمانوں کی



تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی اقتصادی اور تعلیمی حالت بھی بہتر ہو رہی ہے۔ شہر سیئول کے مرکز اسلامی سے ملحق ایک اسلامی مدرسہ بھی ہے جس میں ابھی ابتدائی درجات کی تعلیم کا انتظام ہو سکا ہے۔ ایک جامعہ اسلامیہ کے قیام کا پروگرام بھی ہے تاکہ اس سے مسلمانوں کی دینی اور علمی ضرورت پوری ہو سکے۔

**مسجد اور مرکز اسلامی** ۱۹۶۷ء میں کوریائی وزارت سے اتحاد الاسلامی الکوری کو منظوری ملی اور اسی زمانہ کے وہاں کے صدر نے سیئول میں مسجد اور مرکز اسلامی کے لئے ۵ ہزار مربع میٹر اراضی بھی دے دی چنانچہ ۱۹۷۱ء میں مرکز کی بنیاد رکھی گئی۔ جنوبی کوریا کے مسلمانوں کے ایک وفد کی درخواست پر شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے اس کی تعمیر کے لئے مالی امداد دی۔ ۱۳۹۲ھ میں اتحادِ اسلامی کی طرف سے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ایک سال بعد مرکز کے صدر نے مالیات کی فراہمی کے لئے عرب اور مسلم ممالک کا دورہ کیا اور جب اس کے قیام کی تکمیل ہو چکی تو ۱۳۹۴ھ میں اس کی تقریب منائی گئی جس میں عرب اور مسلم ممالک کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔

۱۳۹۵ھ میں صبری سوج اور ابوبکر کیم نے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی کانفرنس میں شرکت کی۔ ایک سال بعد مرکز سے ملحق ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ جس کی تعمیر کے اختتام پر ہونے والے جلسے میں ۱۹ مسلم ملکوں کے ۱۵ مندوبین شریک تھے۔ ۱۴۰۱ھ میں مجلس اسلامی الکوری نے بوسان اور کوانجو دونوں شہروں میں مسجد کی داغ بیل ڈالی۔

۱۳۹۶ھ میں مرکز اسلامی کی طرف سے شہر سیئول میں ایک مسلم اقلیت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسی سال اسی کے زیر انتظام عربی زبان کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارہ نے سب سے پہلی کتاب "کیف تکون مسلما" کے عنوان سے شایع کی۔ پھر جمعیۃ اسلامیہ خیریہ وجود میں آئی۔ اتحاد اسلامی نے شہر بوسان میں ایک مسجد بنوائی۔ اس شہر میں تین سو سے زائد مسلمانوں

کی آبادی ہے۔ مرکز اسلامی نے اسلام کی اشاعت کے لئے کوریائی زبان میں متعدد کتابچے شایع کئے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں سعودی عربیہ اور کویت کے ایک وفد نے کوریائی مسلمانوں سے ملاقات کی اور ایک اسلامی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ جس کے لئے شاہ فہد بن عبدالعزیز نے ۲۵ ہزار ڈالر سالانہ عطیہ بھی مقرر کر دیا ہے۔

**اسلامی تنظیمیں** ۱۹۵۵ء میں شہر سیئول میں منعقدہ اجتماع میں پہلی مرتبہ جمعیت اسلامی وجود میں آئی۔ جس نے بعد میں اتحاد اسلامی الکوری کی شکل اختیار کر لی جس کی دعوتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک شاخ ۱۹۷۸ء میں جدہ میں قائم ہوئی اور دوسری شاخ کویت میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ کوریا میں جمعیۃ الخیریہ الاسلامیہ، جمعیۃ الشباب المسلم المنظمۃ الطلابیہ الکوریہ، لجنۃ الدعوۃ التبلیغ وغیرہ بہت سی تنظیمیں ہیں جو علمی، تہذیبی اور سماجی میدانوں میں کام کر رہی ہیں۔ اتحاد اسلامی کی متعدد کمیٹیوں کو معہد اللغۃ العربیہ کی سرپرستی حاصل ہے۔

اتحاد اسلامی کے آئندہ پروگرام میں اسپتال، ٹکنیکل کالج اور کارخانے وغیرہ کا قیام شامل ہے۔

(ماخوذ التضامن الاسلامی، مکہ مکرمہ۔ فروری ۱۹۸۹ء)

---

## سفرنامہ روم و مصر و شام

از علامہ شبلی نعمانی

مولانا شبلی مرحوم کا سفرنامہ جس میں مولانا نے ترکی، شام اور مصر کے مسلمانوں کے علمی، تعلیمی، اخلاقی اور تمدنی حالات اور دیگر وقایع سفر اور حوادث سیاحت بہ تفصیل بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کے طبع جدید میں اشاریہ بھی شامل ہے۔ قیمت ۸۰ روپے



## معارف کی ڈاک

# کنیڈا سے ایک پُر از معلومات مکتوب

۲۵ جولائی ۲۰۰۰ء

محترم جناب عمیر الصدیق صاحب! السلام علیکم

امید اور دعا ہے کہ سب خیریت ہو۔ کلکتہ سے ۱۱ جون کو روانہ ہو کر اسی تاریخ کو شام ۵ بجے ٹورنٹو، کنیڈا پہنچا۔ ہندوستان کی تاریخ اور دن میں قریب ½۱۰ گھنٹوں کا فرق ہے۔ اس ہوائی جہاز کے سفر میں جو کلکتہ سے مسٹرڈم کا فاصلہ ۸ گھنٹوں میں طے کرتا ہے اور جہاں ½۲ گھنٹوں کے بعد دوسرا سفر ٹورنٹو کے لئے شروع ہوتا اور اس میں قریب ۱۲ - ½۱۲ گھنٹے صرف ہوتے ہیں اتنے طویل سفر کے بعد بڑی تکان آجاتی ہے اور چند روز صرف سونے اور لیٹنے کا جی چاہتا ہے۔

مغربی ممالک کا سفر متعدد بار کر چکا ہوں اور کنیڈا کا یہ ساتواں سفر ہے۔ مگر اب کی دفعہ شیرین کے ساتھ قیام کرنے سے یہاں کے حالات کا جائزہ لینے میں آسانیاں ہوئیں۔ اس لئے ان کو لکھنا مناسب سمجھا تاکہ آپ کو اور مولانا ضیاء الدین صاحب کو کنیڈا کے حالات کا کسی قدر علم ہو جائے۔

کنیڈا ایک بہت بڑا ملک ہے اور فی الحال دنیا کے تمام ملکوں میں سب سے عمدہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ گذشتہ کئی برسوں سے اس کو سب سے عمدہ ملک قرار دیتی رہی ہے۔ کنیڈا کے باشندے اپنے ملک پر فخر کرتے ہیں۔ وہ دوسرے ممالک سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں، شروع میں انگریز کنیڈا کے جنوبی صوبوں اور فرانسیسی شمالی صوبہ کیوبک میں آباد ہوئے

اور ان کی آبادی بڑھتی رہی۔

اتنے بڑے ملک میں معدنیات اور قدرتی وسائل کی فراوانی کی وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے علاوہ دوسرے یورپی ممالک کے باشندے بھی ترکِ وطن کرکے یہاں آباد ہوتے گئے۔ عرصے سے جاپان اور چین کے باشندے بھی یہاں آباد ہیں۔ دیگر ایشیائی ممالک کے باشندوں کی آمد گذشتہ ۵۰ برسوں سے زیادہ رہی ہے اور کسی قدر تعصب کے باوجود کینیڈا کی حکومت ان کا خیر مقدم بھی کرتی رہی ہے۔

یہاں کے ہر ہر شہری کے حقوق کی پوری حفاظت کی جاتی ہے، کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کی جاتی، مساوات اور اخوت کا بول بالا ہے۔ شرافت سے پیش آنا، بے حد محنت، وقت کی زبردست پابندی، اپنے اپنے کاموں میں پوری دلچسپی اور شوق سے منہمک رہنا یہاں کے باشندوں کا شیوہ ہے۔ سب کے لئے قانون کی پابندی ضروری ہوتی ہے اور غلط یا قانون کے خلاف کام کرنے پر خواہ وہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں گوروں اور کالوں میں کبھی کبھی امتیاز نمایاں ہو جاتا ہے۔

شہریوں میں میل جول، تعاون اور رواداری عام ہے۔ اگر کبھی جبر یا ظلم ہو بھی جاتا ہے تو اس کی خبر اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں میں شایع ہوتی ہے اور حکومت اس کا تدارک کرتی ہے۔ اس فضا میں پرورش پانے اور رہنے سے پورے ملک میں ایک عمدہ اور خوشگوار ماحول پایا جاتا ہے۔ اور ہر طرف سے "کینیڈا مجھے تجھ سے محبت ہے" کی آواز سننے میں آتی ہے۔

چاہے کینیڈا کے قدیم اور پشتینی شہری ہوں یا نئے شہری سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ حکومت کے وزرا تک کو لائن لگانا پڑتا ہے۔ اس طرح خلافت راشدہ کی ایک



جھلک سامنے آجاتی ہے۔ جو لوگ مجبور یا ضعیف ہو جاتے ہیں ان کی ہر ضرورت حکومت کی طرف سے پوری کی جاتی ہے۔

قومی عمارت کی بنا و تعمیر میں اچھے معلمین کا بڑا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ کینیڈا کے اسکول اور ان کا طریقہ تعلیم جس طرح کا ہے اس میں تعلیمی ترقی لازمی ہے۔ دسویں درجے تک مفت لازمی تعلیم دینا حکومت کی ذمہ داری ہے، فرداً فرداً ہر طالب علم کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اچھے طالب علموں کے کلاس الگ کر دئے جاتے ہیں اور ان کے لئے منتخب معلم مقرر کئے جاتے ہیں جس سے ان کی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سال میں بچوں کے والدین کے ساتھ کم از کم چار بار انفرادی طور پر ہر معلم گفتگو کرتا ہے۔

کاش ایسا ہی ہمارا ملک بھی ہوتا، اگر اس کے حالات میں بہتری نہ ہوئی تو ہماری حالت خراب سے خراب تر ہوتی جائے گی۔

میری کتاب "جرس کارواں" کا کام کہاں تک آگے بڑھا؟

میری اور اہلیہ کی طرف سے اپنی اہلیہ اور بچوں کو سلام و دعا کہہ دیں۔ مولانا ضیاء الدین اور جناب عبد المنان بھی سلام قبول کریں۔

والسلام

خاکسار: مقبول احمد

اگر ممکن ہو تو کینیڈا اور امریکہ کے "معارف" کے خریداروں کی فہرست پتے اور فون نمبر بھی روانہ کریں۔

## المنازل والدیار کا مخطوطہ

مکرمی مولانا اصلاحی صاحب!

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ یہ عریضہ ارسالِ خدمت ہے۔

مارچ ۲۰۰۰ء کے معارف میں تلخیص و تبصرہ کے تحت عیسی فتوح کے مضمون "اسامۃ بن منقذ

الکنانی وقصة مخطوطة کتابه المنازل والدیار"۔ (مجلة مجمع اللغة العربیة بدمشق، مج ۴، ج ۲) کی تلخیص شایع ہوئی تھی، جس میں بڑے تساہل سے کام لیا گیا ہے اور بڑی فروگذاشتیں ہیں جن کی وجہ سے مضمون کا ایک خاطر خواہ حصہ مسخ ہوگیا ہے۔ اس لئے نظرِ ثانی کے بعد مضمون دوبارہ شایع کرنے کی ضرورت ہے، ذیل میں کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی جارہی ہے تاکہ اصل مضمون کی ہلکی سی جھلک نمایاں ہوسکے[1]۔

تلخیص کا عنوان اسامہ بن منقذ کی کتاب "المنازل والدیار" کی گم شدگی اور بازیابی اور شروع کا پیرا چونکا دینے والا ہے: اصل کے عنوان پر اکتفا مناسب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب گم تھی اور حال ہی میں دریافت ہوئی ہے، جب کہ اس کو دریافت کرنے والا مستشرق کراتشکووسکی (I. J. KRATC-HKOVSKI) ۱۹۵۱ء میں مرچکا تھا اور اس کتاب کا عکس ۱۹۶۱ء میں روس سے، پھر اس کے دو عربی ایڈیشن (تحقیق شدہ) دمشق (۱۹۶۵ء) اور قاہرہ (۱۹۹۱ء) سے منظر عام پر آئے، اس مخطوطے کا انکشاف ۱۹۱۸ء میں ہوا جیسا کہ خود اصل عربی مضمون میں ہے، لیکن تلخیص نگار نے اس اہم سال کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔

"جس کا انگریزی ترجمہ ... فلیپ ہٹّی نے تحقیق و تحشیہ کے بعد شایع کیا ہے": عربی میں اس طرح ہے "الذی حققه المورخ اللبنانی الدکتور فیلیب حتی" جس کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ (کتاب الاعتبار) کو ڈاکٹر فلپ حتی نے تحقیق کے ساتھ شایع کیا ہے یا ایڈٹ کیا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ حتی نے نیویارک سے

[1] معارف: ابھی تلخیص نگار دار المصنفین میں زیر تربیت ہیں، کچھ عرصے سے اس کالم میں ان کی تحریریں چھپتی ہیں، راقم کے سامنے اصل مضمون اور اشعار کا متن نہ تھا، مکتوب نگار شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اصل مضمون کو سامنے رکھ کر فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی، تلخیص نگار کو بھی خوش ہونا چاہئے کہ جس موضوع کا انتخاب انہوں نے کیا وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سربراہ اور دوسرے اہل علم کی نگاہ توجہ کا مرکز بنا۔ "ض"



انگریزی ترجمہ بھی شایع کیا ہے۔

"جس کی نقل سیدر وسو نے حلب سے بہم پہنچائی ہے جو وہاں کے سفیر تھے اور جس کی وہ تحقیق و اشاعت کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اب عربی میں پڑھیے: "بعد ان نقلها السید "روسو" قنصل سویسرة فی حلب ثم قام بعد ذلک بتحقیقها ونشرها" جسے ہم (سیاق و سباق کے اعتبار سے) اس طرح کہیں گے: (جسے) جناب روسو (ROUSSEAU) نے وہاں پہنچا دیا تھا جو حلب میں سوئٹزرلینڈ کے قونصل (CONSUL) تھے، پھر انہوں (کراتشکووسکی) نے اسے ایڈٹ اور شایع کیا۔

مضمون نگار نے مندرجہ ذیل دو شعر ذکر کئے ہیں:

حمائم الایك هیجتن اشجانا — فلیبك اصدقنا بثا واشجانا

قالوا: تاس، وقالوا: بمن واذا — افردت بالرزء ما انفك اسوانا

تلخیص نگار تحریر فرماتے ہیں:

اے کبوترو! تم کو غم و اندوہ نے برانگیختہ نہیں کیا۔ حالانکہ ہم میں جو غم خوار ہیں، وہ رو پڑے تو انہوں نے کہا: صبر کرو، یعنی ہم کس پر آنسو بہائیں۔ (وہ یہ کہہ کر اڑ گئیں) اور جب میں ان کے غم میں تنہا ہوا تو میرے آنسو جاری ہوگئے اور میں کبھی بھی ان کے غم سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک عام مفہوم کا تعلق ہے تو وہ بظاہر یہ ہے:

اے گھنے درختوں کی فاختاؤ (کبوترو) تم نے غم و اندوہ کو برانگیختہ کر دیا ہے، (آؤ) ہم میں غم و اندوہ میں جو زیادہ سچا ہو (یعنی جو زیادہ غم زدہ ہو) وہ روئے (یعنی ہمیں تم سے زیادہ رونے کا حق ہے)۔

انہوں نے کہا: دوسروں کو دیکھو (نمونہ بناؤ) انہوں نے جواب دیا (ہم سے بڑھ کر غم عشق میں کون ہے؟) کس کو دیکھیں (کس کی اتباع کریں) جب کہ ہم ہی مصیبت اور غم و سوز میں یکتا ہیں اور ہم ہی (اس معاملے میں) سب سے بڑے ہیں، یعنی ہم ہی سب سے زیادہ غم و اندوہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ [آخر کے مصرعے میں مفرد کا ترجمہ محل کی مناسبت سے جمع میں کیا گیا ہے۔]

والسلام

محمد نعمان خاں: شعبۂ عربی
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

## ادبیات

### ہے ایک شور بپا میر کارواں نہ رہا

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے انتقال پُرملال پر)

از ڈاکٹر محمد حسین فطرت *

عظیم سانحہ ہے بوالحسن علی کی وفات
کہاں سے لائیں گے اب ایسا مردِ والاصفات

ہے ایک شور بپا میر کارواں نہ رہا
ہر ایک گل ہے فسردہ کہ باغباں نہ رہا

مری نگاہ میں وہ وقت کے مجدد تھے
جہادِ حرف میں مشغول تھے مجاہد تھے

جہادِ حرف کا بھی مرتبہ نہیں کچھ کم
کہ ضربِ تیغ و سناں سے ہے بڑھ کے ضربِ قلم

کہاں سے لاؤں میں تاب بیاں بیاں کے لئے
تو ایک گوہر نایاب تھا جہاں کے لئے

وجودِ ناز ترا دفترِ معارف تھا
شکم پرست سیاست کا تو مخالف تھا

ترے قلم کو ہر اک بوالبیاں نے چوم لیا
اسے تو خود مری روحِ تپاں نے چوم لیا

مزاجِ دیں کا ہے غماز تیرا قولِ متیں
علوم پر تو کسی کی اجارہ داری نہیں

جو چیز ہے یہاں مطلوب وہ ہے زادِ کمال
عمل سے فخرِ عرب ہو گئے حبش کے بلالؓ

امام بن کے پڑھائی صہیبؓ نے بھی نماز
وہ رومی ہو کے صحابہ کی صف میں تھے ممتاز

ابوالحسنؒ کے مقالات علم کی ہیں برات
یہ اپنا نورِ بصیرت ہے ان کے در کی زکات

---

* شوکت علی روڈ، بھٹکل۔



وہ آج ہم میں نہیں ان کا کام باقی ہے
زبانِ خلق پہ حضرت کا نام باقی ہے

مری نگاہ میں وہ ایک ولیِ کامل تھے
مقامِ شاعرِ فطرتؔ کے بھی وہ قائل تھے

## غزل

از پروفیسر رشید کوثر فاروقی صاحب *

تو اب کیا روؤں دکھڑا درمیانِ زندگانی کا
سرا دونوں طرف جنت میں ہے میری کہانی کا

بشارت ہو کہ ہر بچے کا مستقبل جوانی ہے
جوانوں سے نہ کہنا کیا ہے مستقبل جوانی کا

گداؤں کی نقاب الٹو تو کل کے تاجور نکلیں
یہ بابِ آخریں ہے دفترِ صاحبقرانی کا

بھلا ہو ان کا مورخ کی نگاہ بزمیں تنگ ہے
لقب تھا خانہ زادانِ حضرتِ عرش آشیانی کا

نہ سمجھا کوئی ابن علقمی اب تک کہ ارذل کی
غلامی ارمغاں ہے بارگاہِ ایلخانی کا

کوئی یہ تو بتاؤ بے محبت زندگی کیا ہے
بڑا غل ہے جہاں میں دردِ دل کی جاں ستانی کا

مصور وہ کہ جب منہ سے کہے ہو جا تو ہو جائے
نہ جھگڑا نقشِ اول کا نہ قصہ نقشِ ثانی کا

دعائے آخرِ شب میں سرِ مژگاں یہ عالم ہے
نہالوں سے نسیمِ صبح کی شبنم چکانی کا

ذرا سرکا کے دیکھا پردۂ مظلومیٔ نسواں
تو ہر اکبر قتیلِ ناز تھا مریم زمانی کا

مجھے تو سامنے کی بات ہی اعجاز لگتی ہے
میں لذت چش نہیں ہوں ذوقِ اعمانِ معانی کا

بجائے خود تو کوثرؔ ہیچ ہے لیکن نصیب اس کو
شرف ہے راکبِ معراج کی ہم کاروانی کا

---

* ۹/۱۰۲ نیتاجی نگر۔ وانو واڑی۔ پونے۔

# غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب ٭

(اسی غزل کی زمین میں پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب کی ایک غزل سے متاثر ہو کر)

دم آخر مریض نیم جاں پر مہرباں کیوں ہو
نگاہ لطف سے حاصل حیات جاوداں کیوں ہو

اسی کے حسن کے جلوے ہیں جب چاروں طرف رقصاں
تو سجدوں کے لئے مخصوص کوئی آستاں کیوں ہو

سر منزل پہنچ کر بھی بھٹک جاتا ہوں منزل سے
مری حرماں نصیبی میر منزل پر گراں کیوں ہو

نشیمن ہیں ہزاروں بجلیوں کی زد پہ گلشن میں
تو پھر میرے نشیمن ہی کے جلنے کا گماں کیوں ہو

ہنر، انساں کو سکھلاتی ہے طوفانوں سے ٹکرانے کا
خلاف "گردش تقدیر" سرگرم فغاں کیوں ہو

اسی کے دم سے ہے جب رونق ہستی تو پھر یارب!
ترا بندہ، تری دنیا میں بے نام و نشاں کیوں ہو

ہماری لغزشوں سے ہے بہار جام و پیمانہ
تو پھر اے پیر میخانہ! ہمیں سے سرگراں کیوں ہو

نہ لائے تاب جلوہ طور پر جب حضرت موسیٰؑ
تو حائل اس کے جلوؤں کی نگاہ ناتواں کیوں ہو

کہانی ختم ہے مجھ پر تری ایذا رسانی کی
مری روداد رنج و غم کسی کی داستاں کیوں ہو

"مری بیتابی دل ڈھونڈ لے گی خود ہی منزل کو"[1]
تو اے جہد عمل! ممنون میر کارواں کیوں ہو

ہزاروں آستانے ہیں مگر میرے لئے وارث
نذیر[2] و آرزو جیسا کسی کا آستاں کیوں ہو

---

[1] پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب (سابق صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی غزل کا مصرع

[2] پروفیسر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

---

٭ کاشانۂ ادب۔ سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔



## مطبوعات جدیدہ

**اردو تنقید کا رومانوی دبستان** از جناب ڈاکٹر محمد خاں اشرف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۱۸، قیمت ۲۲۵ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

رومان اور رومانیت کے الفاظ اردو تہذیب میں زیادہ پسندیدہ نہیں رہے بادی النظر میں توان کو غیر ثقہ اور غیر علمی کے مترادف سمجھا گیا، حالانکہ اصطلاحاً یہ ایک ادبی روایت بلکہ ایک جدا فکر و فلسفہ کے حامل ہیں، یورپ میں اٹھارویں صدی کے آخر میں برپا ہونے والی اس تحریک نے بیسویں صدی کے اوائل تک یورپ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں اپنے وجود کے گہرے نقوش و اثرات ثبت کئے، اردو ادب بھی اس سے غیر متاثر نہیں رہا، ایک دور تو ایسا گزرا جس میں رومانوی فکر و اسلوب نے ذہنوں کو پوری طرح مسخر کر لیا تھا، لیکن رومانوی ادب کی تاریخ پر قلم کم اٹھایا گیا اور اس میں بھی لہجہ متعذرانہ رہا۔ اس کتاب میں جو اصلاً ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، لائق مقالہ نگار نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، انہوں نے اس تحریک کی ماہیت اور مغرب میں اس کے آغاز و ارتقاء پر عالمانہ بحث کرنے کے بعد اردو ادب و تنقید پر اس کے اثرات کا جامع جائزہ اور نہایت متوازن تجزیہ کیا ہے، اس سے ان کے مطالعہ اور غور و فکر کی صلاحیت و اصابت کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہنا کہ "ہندو، مسلمان تہذیبوں کے تصادم سے ہندوستان میں ایک نئے طاقتور اور فروغ پذیر تمدن کی بنیاد اسی طرح رکھی جا سکتی تھی جس طرح یورپ میں ہوا کہ وہاں

اسلامی اثرات کے اثر اور رد عمل سے عہد جدید کا آغاز ہوا اور بعد میں وہی بین الاقوامی
یوروپی تمدن کی بنیاد بنا، مگر ہندوستان میں ایسا نہ ہوا" رومانی تنقید کے پیش روؤں
میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا عبد الحلیم شرر کے ساتھ علامہ شبلی کا
ذکر بظاہر باعث استعجاب ہے، لیکن لایق مقالہ نگار نے ان کی تحریروں، نقطہ نظر
اور اسلوب کے غائر مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "اس علمیت اور وسعت کمال
کی بنیاد شبلی کی طبعی رومانویت پر تھی"، محاکات و تخیل، شعر، موسیقی اور شاعری
و افسانہ نگاری کے متعلق علامہ شبلی کے متعلق اس رائے سے اختلاف دشوار ہے کہ
"شبلی کا سب سے اہم کارنامہ شعر و ادب کے ذوق و وجدان کا فروغ اور اسلوب
کی دلکشی تھا..... اور جو رومانوی تنقید کا خاص اسلوب رہا"، اردو شاعری میں
ولی دکنی، میر و غالب اور نظیر اکبر آبادی کو رومانویت کے پیش رو شاعروں کی حیثیت
سے پیش کیا گیا ہے، لیکن یہ انتخاب باستثناء نظیر خود اس اصول کے منافی معلوم
ہوتا ہے کہ "رومانویت، بغاوت، تغیر اور انقلاب کے تیشے سے کلاسکیت کے
بتوں کو توڑتی ہے"، جہاں تک رومانوی دکھ اور کرب کے ادراک و احساس
کی بات ہے اردو کے تمام متقدمین شعراء کے ہاں اس کی کمی نہیں، فراق گورکھپوری
کے نظریۂ ادب کی بحث بھی بڑی دلچسپ ہے، جس میں ان کے خیالات کو
تضاد کا شکار بتایا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اردو کے کئی رومانی نقادوں کی
تغلیط بھی کی ہے، لیکن بڑے متوازن اور پر اعتماد لہجہ میں، ان کی پوری بحث کا
خلاصہ یہ ہے کہ "حقیقی معنوں میں رومانوی تنقید نے اردو ادب کو طفولیت
کی عمر سے نکال کر جوانی کی منزل میں داخل کیا، ایک جگہ غلطی سے مغرب یا



یورپ کے بجائے مغربی یورپ لکھا گیا ہے، موسوم کے مفہوم میں کئی جگہ معنون کا لفظ بھی
کھٹکتا ہے، علم عروض کو عروج بنا دیا گیا ہے۔

**خاتم النبیینؐ** از علامہ انور شاہ کشمیریؒ ترجمہ و تحقیق جناب حکیم مولانا عزیز الرحمن
اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۲، قیمت درج نہیں، پتہ:
مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ۔

مرزائے قادیان اور فتنہ قادیانیت کے رد و ابطال میں علمائے حق نے تقریر و تحریر کے
ذریعہ برابر اپنا فرض ادا کر کے امت کو ایک بڑی سازش و آزمایش سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن سعی و
کوشش کی ہے، زیر نظر رسالہ اسی سلسلۂ احقاق حق و ابطال باطل کی قابل قدر کڑی ہے، اس
رسالے کے وقت تحریر تک قادیانیت کے مکر و نفاق کے بعض مظاہر سے امت کے چند حلقوں میں
اس فتنہ کی شناعت اور اصل حقیقت کامل طور پر نہیں کھلی تھی، لیکن جن اصحاب فراست و بصیرت
اور اہل فکر و نظر نے اس کی سنگینی و خطرناکی کا بروقت ادراک کیا ان میں محدث کبیر حضرت شاہ
انور کشمیریؒ بھی تھے، انھوں نے آیت خاتم النبیین کی روشنی میں مسئلہ ختم نبوت کو ایسے عالمانہ اور
مدلل انداز میں واضح کیا کہ مدعی نبوت کے ہر وسوسہ اور تلبیس کا ازالہ ہو گیا، اصل رسالہ فارسی
زبان میں تھا، اردو میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے جن میں بعض اب نایاب اور ہندوستان میں
کمیاب ہیں، فاضل مترجم نے اس کمی کی تلافی کر کے ایک بڑا فریضہ ادا کر دیا ہے، اسلوب و مضامین
کے اعتبار سے یہ عام قارئین سے زیادہ خواص اہل علم کے لئے نافع و کارآمد ہے، ترجمہ میں
اسی لئے زیادہ سلاست نہیں آسکی ہے، اس لئے فاضل مترجم نے اپنے مبسوط مقدمے میں مرزا کی
شخصیت اور دعووں، الہاموں اور پیش گوئیوں کا تجزیہ عام فہم اور دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

تعارف مولانا سید انظر شاہ کشمیری کے قلم سے ہے اور بہت خوب ہے، البتہ فہرست عناوین میں صفحات کا خانہ ہونے کے باوجود ان کے نمبروں کا اندراج رہ گیا ہے، آخری باب کے متعلق بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس کے قلم سے ہے۔

**ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب** از علیم صبا نویدی، مرتبہ جاوید حبیب، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور عمدہ طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ممبئی، علی گڑھ اور ٹمل ناڈو پبلی کیشنز، مونٹ روڈ، چنئی۔

جناب علیم صبا نویدی جنوبی ہند خصوصاً مدراس کے صوبے میں اردو تصنیف و تالیف کا علم بلند کئے ہوئے ہیں، وہ خود صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، ان کی متعدد کتابوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، اس سے پہلے "ٹمل ناڈو کے صاحب تصانیف علماء" کا تعارف بھی کرایا جاچکا ہے اب یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک اور پیش کش ہے جس میں حضرت شاہ سلطان ثانی متوفی ۱۶۸۵ء سے امیر النساء پ ۱۹۵۰ء تک ٹمل ناڈو کی ۶۷ ادبی شخصیتوں کے حالات اور ان کی ادبی و شعری کاوشوں کا تفصیل سے ذکر ہے، یہ تذکرہ بڑا دلچسپ اور معلومات سے پُر ہونے کے علاوہ حیرت انگیز بھی ہے کہ اردو کے مولد و منشا سے بہت دور ٹامل ناڈو کے خطے میں ایسے صاحب ذوق اور قادر الکلام اصحاب فن تھے جن کا کلام زبان و تاثیر میں کچھ کم نہیں، البتہ لائق مولف کا یہ خیال محل نظر ہے کہ اس میں ان ہستیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے جو گوشہ گمنامی کی نذر ہوچکی ہیں، قربی، ویلوری، باقر آگاہ ویلوری، قاضی بدر الدولہ، شاطر مدراسی، شاکر نائطی اور مولانا یوسف کوکن کی شہرت محتاج بیان نہیں۔ ایک گوشہ جناب علیم صبا نویدی کے لئے خاص ہے جس میں تحقیق، شعر گوئی اور افسانہ نگاری میں ان کی خدمات کا اعتراف مختلف اہل قلم نے کیا ہے، شروع میں ٹمل ناڈو میں اردو زبان کی اثر انگیزی کا ذکر مختلف ابواب کے ذریعہ کیا گیا ہے۔



**شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی، ایک سیاسی مطالعہ** از جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد ۹/۱ علی گڑھ کالونی، کراچی ۱۴۔

ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ کے بعض کمیاب و نایاب آثار و باقیات و تبرکات کے حصول اور ان کے جمع و تدوین اور تحشیہ و تعلیق میں اس کتاب کے فاضل مصنف عرصے سے مشغول ہیں۔ کتاب بھی ان کی اسی محنت کا ثمرہ ہے، اولاً یہ ۱۹۸۲ء میں شایع ہوئی تھی لیکن پہلا اڈیشن جلد ختم ہوگیا اب اس دوسرے اڈیشن میں متعدد خطوط اور کئی تحریروں کا اضافہ ہے، حضرت شیخ الہند کی باکمال شخصیت کے متعلق دو مقالے ہیں، باقی ان کے فتاوی، خطوط اور خطبات وغیرہ ہیں، کتاب کے عنوان کے پیش نظر ان تمام مشمولات کا تعلق سیاسی امور سے ہے جن سے حضرت شیخ الہند کی بصیرت و عزیمت کا اثر اور گہرا ہوجاتا ہے، ترکوں کی امداد کے لئے وقف کی زائد آمدنی کے استعمال کے متعلق حضرت شیخ الہند کے ایک فتوی کے ضمن میں علامہ شبلی مرحوم کے ایک فتوی کا بھی ذکر ہے لیکن اس کا ذکر بے ضرورت تندی و درشتی کے لہجہ میں کیا گیا ہے۔

**تسبیح و زنار (قومی یکجہتی کی جھلکیاں)** از جناب ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۱۲۸، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: رحیم اسٹورس حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگ پور ۱۸۔

اس کتاب میں وقت کی ایک بڑی ضرورت کے پیش نظر، رواداری، یگانگت اور اتحاد و اتفاق کی ان کوششوں کا بیان ہے جس کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں کے سنجیدہ، مخلص اور صاحب فہم عناصر سرگرم عمل رہے، صوفیوں، سنتوں کے پیغام محبت، غیر مسلم شعرا کی ذات نبویؐ سے عقیدت، اردو شاعروں کے کلام میں دیوالی اور رام جی کا پُرشوق ذکر وغیرہ موضوعات

پر اچھی تحریریں ہیں، قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو شاعری و صحافت اور خود اردو زبان کے موثر کردار کو بھی واضح کیا گیا ہے، فاضل جلیل جناب مالک رام کا ذکر بھی ہے اس میں یہ جملہ اور بہتر تعبیر کا متقاضی ہے کہ "مالک رام نے غالب سے اطمینان کر لینے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا نشانۂ تحقیق بنایا"۔ لائق مصنف کا مقصد قابل قدر ہے کہ اعتماد اور اعتبار اور مفاہمت و تعاون کی فضا بہرحال قائم ہو کر رہے گی۔

**مسلمان اور تعلیم** از جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۶۸، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اس مختصر لیکن بے حد مفید رسالے میں تعلیم کے موضوع پر چند اہم تحریریں مثلاً تعلیم کی اہمیت و ضرورت، تعلیم اور مسلمان، مغربی نظام تعلیم اور اس کے اثرات، تعلیم میں قدروں اور ضرورتوں کی رعایت وغیرہ یکجا کی گئی ہیں، ہندوستان کے مدارس دینیہ کے نصاب اور اس کی تشکیل میں وسیع النظری کی ضرورت پر جن آرا و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ خاص طور پر ہندوستان میں [illegible] مسلمانوں کی تعلیم کے ذمہ داروں کے لیے غور و فکر کے لائق ہیں۔

**قرآن مجید کے ناموں اور قرآنی دعاؤں کی عظمت مع قرآنی دعائیں** از جناب مولانا حبیب ریحان خاں ندوی و جناب حسن عابد علی، چھوٹی تقطیع، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: دار التصنیف و الترجمہ، ۲/۷ رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال۔

قرآنی دعاؤں سے استفادہ اور ان کی برکتوں کے فیض کو عام کرنے کی غرض سے اس قسم کے مجموعے برابر شایع ہوتے رہتے ہیں، زیر نظر مجموعہ حیدرآباد کے ایک مخلص جناب حسن عابد علی نے مرتب کیا ہے، شروع میں قرآنی ناموں اور دعاؤں کے متعلق جناب مولانا حبیب ریحان خاں کے قلم سے ایک فاضلانہ اور حکیمانہ تحریر بھی موجود ہے جس سے اس رسالے کی افادیت دوچند ہو گئی ہے، دعا، وقت دعا، طریقہ دعا اور قبولیت دعا پر یہ تحریر پڑھنے کے لائق ہے۔

ع۔ص۔